غالب: تحقیق و تنقید

ڈاکٹر محمد یار گوندل

عکس
AKSPUBLICATIONS

غالب: تحقیق وتنقید

ڈاکٹر محمد یار گوندل

عکس
AKS PUBLICATIONS

کتاب	غالب: تحقیق و تنقید
مصنف	ڈاکٹر محمد یار گوندل
صفحات	208
اشاعت	2019
تعداد	500
قیمت	500

عکس

AKSPUBLICATIONS

Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Call # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

انتساب

محققینِ "غالب" کے نام

فہرست

تقدیم

بلاشبہ غالب کی شاعری کے گنجینۂ معنی کا طلسم تا حال تو کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔ غالب مرنے والے شاعر نہیں۔ اسی لیے لکھنے والوں کا مرغوب موضوع ہیں، رہیں گے اور کب تک؟ اُردو زبان کی زندگی تک تو لازماً۔ شاعری کی طرح غالب کی زندگی بھی بڑی طرح دار، تہہ دار اور پیچ وخم والی ہے۔ اپنی کشتیٔ زیست کو ساحل تک پہنچانے کے لیے کیسے بازی گروں کی طرح اپنے آپ کو کھلا دھوکا دیتا رہا اور شعوری طور پر دھوکا کھاتا بھی رہا۔ ماندگی (اجل) کے وقفے تک اپنے واماندگیٔ شوق کے لیے وہ طرح طرح کی پناہ گاہیں تلاشتا اور تراشتا رہا۔ اپنی عالی ہمتی اور اعلیٰ ظرفی کی بنا پر غمِ ہستی کو نشاط اور فرحت وانبساط میں تبدیل کرتا رہا۔ نغمہ ہائے غم کو ہی غنیمت جانتا رہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

حیاتِ غالب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص بیک وقت دو طرح کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک زندگی ایک عظیم مفکر اور اَنا کی انتہاؤں کی:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

....

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

....

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

....

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا، کاش کہ مکاں اپنا

....

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور دوسری طرف اپنی ناکام حسرتوں اور تمناؤں کی، جن کے حصول کے لیے اُسے ثریا سے پاتال میں بھی اترنا پڑا۔ یوں اُس کی زندگی میں بلندی وپستی، انا اور عاجزی، دھوپ اور چھاؤں، جذبۂ شوق اور بے دلی بیک وقت نظر آتے ہیں۔ غالب کی شاعری تو بلاشبہ ہمارے شعور اور اکثر اوقات لاشعور کو بھی جھنجھوڑتی اور بیدار کرتی ہے۔ لیکن اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کی بنا پر اُس کی طرزِ زیست بھی اپنے اندر متنوع تجربات، محسوسات، احساسات اور مشاہدات رکھتی ہے۔

اس کتاب میں سات مضامین شامل ہیں جو وقفے وقفے سے گذشتہ دس برسوں کے دوران لکھے گئے۔ اِن میں کچھ مضامین ادبی تحقیقی وتنقیدی رسائل میں طبع ہو چکے ہیں۔ لیکن اب اُن میں بھی خاصی ترمیم وتنسیخ اور اضافہ ہوگیا ہے۔ بعض جگہ واقعات کی معمولی تکرار ہے لیکن اس کا سیاق مختلف ہوگا۔ اِس تصنیف میں بھی زیادہ تر بات غالب کی شخصیت، ذہنیت اور زندگی کے ہی مختلف پہلوؤں پر کی گئی ہے۔ پہلے مضمون "حیاتِ غالب کے چند پہلو" میں حیاتِ غالب ہی کی دھوپ چھاؤں کا تذکرہ ہے۔ جس کے مطالعے سے ہمیں اُن کی عملی زندگی میں واضح تضاد اور دورنگی کی کیفیات نظر آتی ہیں۔ کچھ زندگی کے خوابوں کی صورت گری میں جس طرح شاعری میں وہ خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق ہے:

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا میرے آگے

اسی طرح اپنی شخصی زندگی میں وہ کبھی اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کرتا نظر آتا ہے۔ جون ایلیا نے تو کہا تھا کہ:

مَیں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

لیکن غالب کا زندگی کے بارے میں رویہ کچھ برعکس تھا۔ وہ بھی عجیب تو تھا لیکن اُسے صرف اپنے پندار کے صنم کدے کی بربادی کا ملال ہمیشہ دامن گیر رہا۔ وہ ساری زندگی صحرا میں بیٹھ کر آئینِ باغبانی تالیف کرتا رہا۔

دوسرا مضمون ''شمس الرحمٰن فاروقی۔ میر یا غالب پرست'' ہے۔ جس میں وہ میر کی میری کا دفاع کرتے کرتے غالب کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میر پر ''شعرِ شور انگیز'' لکھتے وقت اُن کے اعصاب اور لاشعور پر غالبؔ ہی غالب رہا۔ یعنی آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا، والا معاملہ بن گیا۔

تیسرا مضمون ''غالب پر معاندانہ تحریریں'' ہے۔ جس میں غالب کی زندگی سے لے کر وفات تک اور اُس کے بعد کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھا مضمون غالب کی تصنیف ''دستنبو'' کے حوالے سے ہے۔ جس میں کتابِ مذکور کی غرض وغایت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

غالب کے اثرات تو مابعد کبھی ادبا پر پڑے ہیں جن میں زیادہ نمایاں رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، مشتاق احمد یوسفی، اقبال اور فیض نمایاں ہیں۔ اگلے دو مضامین ''فیض کے غالب سے ذہنی روابط'' اور ''مشتاق احمد یوسفی: غالب کے مشتاق'' اسی حوالے سے ہیں۔

کتاب کا آخری مضمون اُس ''کولمبس'' کا ہے جس نے غالب کو دریافت کیا تھا۔ میری مراد الطاف حسین حالی اور ''یادگارِ غالب'' سے ہے اور اس ضمن میں ہم حالی کے ممنونِ احسان اور شکر گزار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج 'غالبیات' کے چھتنا ور درخت کی یادگار، یادگارِ غالب ہی ہے۔ غالب کی ڈیڑھ صد سالہ برسی کے موقع پر یہ کتاب غالب کے حضور ایک سپاس نامہ ہے۔

اور آخر میں اُس 'مجی' کا شکریہ جس نے مجھے اس کتاب کی اشاعت پر کمر بستہ کیا۔

ڈاکٹر محمد یار گوندل

۱۵ فروری ۲۰۱۹ء

حیاتِ غالب کے چند پہلو

حیاتِ غالب کے چند پہلو

غالب کا شوق واماندگی تا دم مرگ پناہیں تراشتا رہا۔ اس کی انا، خود پسندی اور انفرادیت کا اظہار اس کی زندگی میں قدم قدم پر جلوہ گر ہوا ہے۔ وہ اپنی انا کو مجروح ہوتے ہوئے دیکھنا کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غالب ایک طرز زیست کا نام بھی ہے۔ اُس کی ہزاروں خواہشیں اور معاشی و مادی مسائل ایسے تھے جن کی بنا پر کبھی کبھی اس کو اپنی انا کے پندار کا صنم کدہ ویران بھی کرنا پڑا۔ غم روزگار کے کٹھن لمحوں میں غالب کے ظاہر و باطن میں کہیں کہیں تضاد کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی اُس کی انا کے تحفظ کا ایک وسیلہ ہے۔ غالب ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دنیادار انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں انا کی سختی کے ساتھ ساتھ عیار طبع خریدار دیکھ کر بک جانے کی مصلحت بھی پائی جاتی ہے۔ مطلب برآوری کے لیے انہیں بعض اوقات اپنی انا کو پس پشت بھی ڈالنا پڑا۔ اصل میں یہ سب کچھ دنیاداری کا تقاضا تھا اور اپنے آپ کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کا حربہ تھا۔

غالب کی انانیت میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف تو انگریز حکام کے مداح اور بہی خواہ ہیں۔ اپنے درباری اعزاز میں اضافہ چاہتے ہیں اور ہر چھوٹی بڑی تقریب پر "صاحبان عالی شان" کی مدح میں قصیدے لکھتے ہیں۔ دوسری طرف محض اس بات پر دہلی کالج کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ "صاحب سکتر" اپنی نشست سے ان کی پزیرائی کے لیے کیوں نہیں آئے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> فی الاصل غالب کی شخصیت میں تضاد یا تصنع کا شائبہ بھی نہیں اور نہ ہی اس کی شخصیت مجروح اور منقسم ہے۔ اس کے انکشاف و اظہار کی سطحیں البتہ دو ہیں۔ ایک وہ ہے جس میں جسم کی مادی ضروریات غالب ہیں۔ دوسری وہ جہاں تخیل نے مادی ضروریات ہی کو نہیں بلکہ جذبے اور خواہش کی تہ در تہ کیفیات کو بھی ایک لطیف سی صورت عطا کر دی ہے۔ مقدم الذکر سے اس کی داستان حیات منسلک ہے اور موخر الذکر سے اس کی داستان شوق۔ تصویر ایک ہے لیکن رخ دو ہیں۔ (۱)

ہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ غالب کی نام نہاد ذاتی کمزوریاں ان کے ادبی مقام کے تعین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ انسان تھا کوئی فرشتہ نہیں۔ اس مضمون میں غالب کے بعض ایسے بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہے جن میں انہوں نے اپنی انا کے تحفظ اور مطلب برآوری کی غرض سے مصلحت کوشی سے کام لیا جس کی بنا پر کہیں کہیں ان کے قول و فعل میں تضاد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ غالب اپنے حسب و نسب کے بارے میں منشی حبیب اللہ ذکا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔۔۔ (۲)

اسی طرح غالب نے ایک تذکرے کے لیے اپنے حالات لکھے جس میں لکھا:

> اسد اللہ خاں عرف "مرزا نوشہ" غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی سلطان بر کیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔۔۔ (۳)

کلیات نظم فارسی میں غالب کا ایک قطعہ ہے جس کی بیت ۳ یہ ہے:

ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

غالب نے اس کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے کہ ایک بہمزۂ مفتوح و موحدۂ مفتوی قومی

ازقوم ترک۔ اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

مجھے یاد آتا ہے کہ حالی نے یادگار غالب میں غیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا آغاز ایک ترک لاچین (خسرو) سے ہوا، اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک (غالب) پر ہوا۔ جناب مہر اپنی کتاب غالب (طبع اصدے) میں فرماتے ہیں کہ "غالب قوم کے ایبک ترک تھے۔" جناب مالک رام بھی انہیں ایبک ترک سمجھتے ہیں (ذکر غالب طبع اول ۲ ص ۱۲) میں نے شجرۃ الاتراک وغیرہ میں سے ڈھونڈا، لیکن نہ پایا۔ کسی اور جگہ بھی ایبک ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں ملا۔ اپنی تحقیق پر بھروسا نہ کر کے میں استاذی ولیدی طوطان (طوغان) سے ان کے ورود پٹنہ کے وقت اس کے متعلق دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا کہ آئی بمعنی ماہ ہے اور بک بمعنی امیر ہے، یہ لقب ہے، ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں۔ غالب پر تعجب نہیں حیرت اس پر ہے کہ غیر جو علم الانساب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، ایسی بات کیوں کہی۔ (۴)

اسی مذکورہ شعر کے ضمن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب "غالب اور آہنگ غالب" میں لکھتے ہیں:

غالب نے کئی جگہ اپنے کو ایبک ترک کہا ہے۔ ایبک کسی ترکی قبیلے کا نام نہیں ہے۔ غالباً اس سے ان کی مراد ازبک ہے، جو بدخشاں میں آباد تھے اور اب بھی آباد ہیں۔ اگر غالب کا یہ بیان صحیح ہے کہ ان کے اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ازبک تھے۔ اگرچہ سمرقند شہر میں تاجک لوگ بڑی تعداد میں ساسانیوں کے زمانے سے آباد ہیں لیکن نواح کی آبادی ازبکوں پر مشتمل ہے جو وہاں صدیوں سے رہتے بستے ہیں۔ اگر غالب کے اجداد کھیتی باڑی کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ شہر کے نواح ہی میں کرتے ہوں گے۔ شہر کے بیچوں بیچ تو کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں قیاس ہوتا ہے کہ

قند کے نواح کے کاشت کرنے والے ازبک ہوں گے۔ سمرقند جہاں سے
ان کے اجداد سمرقند کے نواح کے کاشت کرنے والے ازبک ہوں گے۔
سمرقند جہاں سے ان کے اجداد کا تعلق تھا، اور بدخشاں جہاں سے ان کے
دادا قوقان بیگ خان آئے تھے دونوں جگہ ترکی بولنے والی آبادی اُزبکوں
کی ہے۔(۵)

خود غالب نے بھی لکھا ہے کہ ان کے دادا قوقان بیگ خان کی زبان ترکی تھی۔ اس سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مذکورہ بالا بیان کو مزید تقویت ملتی ہے کہ غالب ایک ترک نہیں تھے۔ غالب کے حسب ونسب پر بات کرتے ہوئے کالی داس گپتا بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

غالب ترکی نژاد تھے۔۔۔ اگرچہ غالب نے لکھا ہے تاہم وہ ایک
ترک نہیں ہو سکتے کیوں کہ ترکوں میں یہ قبیلہ ہے ہی نہیں۔ شاید ازبک
ہوں گے۔(۶)

غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن اس شعر کو دوسرے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جب غالب کی شاعری پر اعتراضات ہو رہے تھے اور انھیں یہ بھی کہنا پڑا کہ:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

کلیات نظم فارسی کے مذکورہ بالا قطعے کی بیت چہارم یہ ہے:

فن آبا ے ما کشا ورزی ست
مرزباں زادہ سمرقند یم

یعنی مرے بزرگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ اس ضمن میں کالی داس گپتا لکھتے ہیں:

> جب صرف دو پشت پہلے ان کے بزرگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو سو پشت سے اپنے آباواجداد کو سپاہی کہنا محض تعلّی ہے۔(۷)

اصل میں مذکورہ بالا شعر کا پس منظر غالب کی ذوق سے معاصرانہ چشمک ہے۔ یہاں غالب نے اپنے فن کو بھی انا کی بھینٹ چڑھانے سے گریز نہیں کیا اور ''پیشہ ء آبا'' کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے برتر گردانا ہے۔ غالب نے منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو خط میں اپنے باپ کے بارے میں لکھا:

> ۔۔۔باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنو جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔۔۔(۸)

لیکن غالب کا یہ بیان بھی درست نہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> غالب کا بیان ہے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں حیدر آباد میں تین چار سو کی جمعیت سے ملازم تھے، لیکن ان کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ واضح رہے کہ نظام علی خاں کے زمانے میں جن کو یہ منصب حاصل تھا، ان کے تمام تر کاغذات دفتر دیوانی (موجودہ آندھرا پردیش آرکائیوز) میں محفوظ ہیں۔ میں نے خاص کر ان کاغذات کو دیکھا لیکن ان میں مرزا عبداللہ بیگ خاں کے متعلق کوئی کاغذ موجود نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں غالب نے اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں اور اپنے والد کی جمعیت کو گڈمڈ کر دیا۔۔۔ چونکہ نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت کے کارگزار رہے ہوں گے۔(۹)

غالب نے اپنے چچا کی وفات کے حوالے سے اپنی عمر کہیں کچھ لکھی ہے اور کہیں کچھ۔

مثلاً انہوں نے ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا:

پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا (۱۰)

اسی طرح غالب نے اپنی پنشن کے مقدمے کے عرضی دعوے مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء میں لکھا:

۔۔۔ (چچا کی وفات) کے وقت میری عمر نو برس تھی اور میرے بھائی کی سات، میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں (۱۱)

پنج آہنگ میں شامل ایک خط جو غالب نے ۱۴ اگست ۱۸۴۹ء کو سراج الدین احمد کو لکھا کہ نصر اللہ بیگ خاں اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے کم و بیش پانچ سال بعد چل بسے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کے دیباچے میں پنج آہنگ کے حوالے سے ایک فارسی خط نقل کیا ہے جس میں غالب نے قاضی محمد صادق خاں اختر صاحب تذکرہ آفتاب عالم تاب کو تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات تحریر کیے ہیں۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے وقت غالب کی عمر دس سال تھی۔ لکھتے ہیں:

چوں پنج سال از عمر من گزشت، پدر از سرم سایہ برگرفت عم من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا نیاز پرورد، ناگاہ مرگش فراز آمد کما بیش پنج سال پس از گزشتن برادر پی سپین برادر برداشت و مرا دریں خرابہ جا تنہا گزاشت (۱۲)

ان بیانات سے مترشح ہے کہ غالب وقتی مصلحتوں کے تحت اپنے چچا کے انتقال کے حوالے سے اپنی عمر میں کمی بیشی کرتے رہے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات اواخر ۱۸۰۵ء سے اوائل ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ اس سے ان کی وفات کے وقت غالب کی عمر دس سال ہونا درست نہیں۔ غالب کی تاریخ پیدائش کے حساب سے چچا کے انتقال کے وقت آٹھ سال اور کچھ مہینے بنتی ہے۔

غالب نے اپنے تخلص اختیار کرنے کے حوالے سے بھی متضاد بیانات دیے ہیں۔
انہوں نے اپنے تخلص کے بارے میں منشی شیو نرائن آرام کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔(۱۳)

لیکن اس بارے میں مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

لیکن دو چار برس صحیح تخمینہ نہیں۔ کیوں کہ وہ اپنی شعر گوئی کی پہلی منزل' بیدل رنگ' کے زمانے میں 'اسد' ہی لکھتے رہے ہیں۔ البتہ فارسی میں سرے سے 'غالب' ہی تخلص استعمال کیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے فارسی کے لیے یہ تخلص پسند کیا تھا، بعد میں ریختے کے اندر بھی لکھنے لگے(۱۴)

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کے تذکرے ''عمدہ منتخبہ'' میں غالب کا ذکر اسد تخلص کے تحت آیا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

اس تذکرے کی ابتدا ۱۲۱۶ھ سے ہوئی اور ۱۲۳۱ھ تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔(۱۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ''اسد'' تخلص سے مشہور تھے۔ حتیٰ کہ غالب نے اپنی پختہ عمر کی شاعری میں گاہے گاہے اسد تخلص استعمال کیا ہے۔
اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف لکھتے ہیں:

لیکن اس (غالب) کے اردو دیوان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کے لیے اس حصہ کلام کو ملاحظہ کیجیے جو پختہ عمر ۱۸۲۳ء تا ۱۸۵۵ء میں موزوں ہوا۔ اس میں آپ کو کئی غزلیں ملیں گی جن میں اسد تخلص کیا گیا ہے۔(۱۶)

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ابتدائی دو چار برس ہی اسد تخلص استعمال نہیں کیا بلکہ بعد میں بھی شعری ضروریات کے تحت اسد تخلص استعمال کرتے رہے ہیں۔ غالب کی دو چار

برس اسد تخلص کی بات کے پس منظر میں کلکتہ میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی موجود ہے۔ کیوں کہ کلکتے میں غالب پر یہ اعتراض بھی کیا گیا تھا کہ یہ شخص دو تخلص رکھتا ہے لہٰذا اس شخص کے بیان کی صداقت مشکوک ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر غالب نے اپنے تخلص کی وضاحت اس موقع پر بھی کی تھی۔ اس حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> یہ امر مخفی نہ رہے کہ جب مجھ غالب خاکسار کا ستارۂ بدبختی کلکتہ پہنچا تو ستم گران وطن میں ایک بد طینت نے جو مجھ سے پیش تر ہی اس جگہ۔۔۔(قیاسی: موجود تھا) اور جو ارکان عدالت سے شناسائی کا دم بھرتا تھا، یہ مشہور کر دیا کہ اس رنجور نے، کہ دہلی سے وارد ہوا ہے، نہ صرف اپنا نام، بلکہ تخلص بھی بدل ڈالا ہے، (چنانچہ) صاحبان بارگاہ کو دفتر کدے کے حاکم کے سامنے اس بے حیثیت کا نام پیش کرنے میں تامل ہوا۔ ناچار میں نے اپنا اردو غزل کا دیوان، جس کی تالیف کو سات سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے اور جس پر اس روسیاہ کی مہروں میں سے ایک مہر تھی، "اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ" مع "۱۲۳۱ ہجری"۔۔۔ دفتر کدے کے حاکم اعلا کے پاس بطور شہادت بھجوا دیا۔۔۔ بے شک وہ مہر بھی اس ہنگامے کے لیے لوح ذوجتین ہے اور اس بحث میں تیغ دودم کا حکم رکھتی ہے۔ چونکہ جس طرح وہ نیا نام رکھ لینے کے دعوے کی تکذیب میں مدعی کا منہ بند کر دیتی ہے، (اسی طرح) میرے اصلی نام کے تسلیم نہ کرنے میں مجھ گمنام کے سکوت کے لیے کافی ہے۔ یقیناً اس فقیر کا نام اسد اللہ خان ہے اور عرفیت مرزا نوشہ اور تخلص غالب، لیکن "غالب" چوں کہ چہار حرفی لفظ ہے اور بعض بحروں میں وزن میں نہیں آتا، (اس لیے) فقیر لفظ "اسد" کو، جو گناہ گار کے نام کا مخفف اور ساتھ ہی سہ حرفی لفظ ہے، کبھی کبھی بطور تخلص استعمال کرتا ہے۔ اگر چہ یہ غلطی ہے تو معاف کی جائے، اور اگر جائز ہے تو انصاف کیا جائے۔ (۱۷)

سفر کلکتہ غالب کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کلکتہ جانے سے پہلے فیروز پور

گئے اور وہیں سے سفر کلکتہ پر روانہ ہو گئے۔ اس بارے میں وہ خود پنشن کی عرضی مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء میں لکھتے ہیں:

> اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتہ مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور سے تو دلی جا نہیں سکا تھا اب باندہ سے کیسے اور کیوں کر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر دلی اور کلکتہ میں دونوں جگہ قانون تو وہی ہے مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ (۱۸)

غالب کے اس بیان پر مالک رام کا خیال ہے کہ:

> اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مرتبہ جو دلی سے نکلے تو پھر فیروز پور، کان پور، لکھنؤ اور باندہ میں کوئی سال بھر کے قیام کے بعد سیدھے کلکتے چلے گئے۔ کلیات نثر غالب (ص ۶۳۔ ۶۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیر آبادی سے الوداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے ان سے ملنے کو دلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ درخواست میں انھوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب خیال نہیں کیا۔ (۱۹)

اسی مذکورہ بالا عرضی میں غالب نے لکھا ہے کہ ایک بار جو وہ دہلی سے فیروز پور کے لیے نکلے تو قرض خواہوں کے خوف کی وجہ سے دہلی واپس نہ جا سکے۔ اس کی توجیہ ڈاکٹر ابو محمد سحر یوں کرتے ہیں:

> درخواست کے مفصل بیانات کی عدم صحت پر مقدمہ بازی کی مصلحتوں کے پیش نظر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلکتے پہنچتے ہی غالب کو یہ احساس دلایا جا چکا تھا کہ ان کو اپنا مقدمہ پہلے دہلی کے رزیڈنٹ کے سامنے پیش کرنا چاہیے تھا۔ رائے چھج مل کے نام کلکتے سے اپنے پہلے ہی خط میں انہوں نے یہ استفسار کیا تھا:

"اگر بندہ را در پیچ و خم استغاثہ بداں افتد کہ در دار الخلافت وکیلی از جانب خود قرار باید داد صاحب این زحمت گوارا خواہند کرد یانے۔ ہر چہ در این مادہ مضمر ضمیر باشد بے تکلف باید نوشت"

چنانچہ انہوں نے اپنی درخواست میں سب سے زیادہ زور اسی پر صرف کیا ہے کہ دہلی میں رہنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا تھا اور وہ وہاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ اسی وجہ سے وہ فیروز پور سے بالا رادہ کلکتے روانہ ہونے کے بجائے سر چارلس منکاف سے ملاقات کی جستجو میں سیدھے کان پور پہنچے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کان پور سے ان کی معیت میں دہلی واپس آئیں گے اور کسی مناسب موقعے پر ان سے اپنا احوال بیان کریں گے لیکن کان پور پہنچتے ہی وہ بیمار پڑ گئے اور انھیں اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ جانا پڑا۔(۲۰)

یوں اپنی عرضی میں تاویلات کا مقصد گورنر جنرل کو یہ باور کرانا تھا کہ دہلی میں چارہ جوئی کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور وہ بڑی مشکلوں سے کلکتے پہنچے تھے تاکہ کلکتہ کے حکام، مقامی حکام (دہلی) کو نظر انداز کر کے ان کی درخواست پر ہمدردانہ غور کریں۔ غالب نے 'خاتمہ گلِ رعنا' میں بھی لکھا ہے کہ وہ فیروز پور سے دہلی واپس آئے تھے۔ کیونکہ جلدی میں وہ مولوی فضل حق کی اجازت کے بغیر ہی فیروز پور روانہ ہو گئے۔ منزل پر پہنچ کر انہوں نے مولوی فضل حق کو صنعت تعطیل میں ایک خط لکھا۔ فیروز پور میں ان کا مقصد حاصل نہ ہوا تو وہ دہلی واپس آ گئے۔ اس کے ایک عرصے بعد انہیں دوبارہ سفر کا خیال آیا۔ لہذا فیروز پور سے دہلی واپس آنے کے تقریباً پانچ ماہ بعد وہ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے۔ قیام لکھنؤ کے بارے میں حالی نے لکھا ہے کہ:

جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ

بھی دیکھتے چلیے۔(۴۱)

لیکن دوسری طرف غالب لکھتے ہیں کہ:

اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا۔ اس لئے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کرکے کرائے کی ایک فینس مجھے لکھنؤ کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا۔(۴۲)

مالک رام نے لکھا ہے کہ غالب کے سفر کی تفصیل سے حالی کا یہ بیان محل نظر ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مالک رام، آغا میر سے ملاقات کے حوالے سے غالب کے ایک فارسی قصیدے کی نشان دہی کرتے ہیں جو وہ نذر کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کلیاتِ نظم فارسی کا قصیدہ (۳۹) جس کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضہ رضواں رفتم
ہوس زلف ترا سلسلہ جنباں رفتم

جیسا کہ اس کی ردیف ہی سے ظاہر ہے، اسی سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ اس کی تشبیب میں متعدد شعر ایسے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے انھوں نے دلی سے روانہ ہوتے ہی شروع کر دیا تھا۔ مثلاً:

چہرہ اندودہ بگرد رہ آغشتہ بخوں
خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنوان رفتم

۔۔۔ آگے چل کر لکھنو پہنچے کا ذکر کرتے ہیں:

لکھنؤ دام نشاطے سر راہم گسترد
بیخود از ولولۂ شوق، پر افشاں رفتم

یقین ہے کہ انھوں نے یہ قصیدہ غازی الدین حیدر اور آغا میر کی خدمت

میں پیش کرنے کو لکھنا شروع کیا تھا۔ آغا میر سے ملاقات کی تجویز پیش ہوئی، تو غالباً یہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات کا جو وقت مقرر ہوا تھا، وہ اتنا تنگ تھا کہ وہ اسے مکمل بھی نہیں کر سکتے تھے۔ (۴۳)

مالک رام کے اس بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا محض بیماری اور "ڈھنگ کا معالج نہ ملنے" پر لکھنؤ جانا محلِ نظر ٹھہرتا ہے۔ قصیدے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سفرِ کلکتہ پر نکلتے وقت قیامِ لکھنؤ بھی ان کے ذہن میں تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا مذکورہ بیان بھی کسی حد تک حقیقت پر مبنی ٹھہرتا ہے۔ حالی اور مالک رام کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں غالب غازی الدین حیدر اور آغا میر سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ اگر واقعی ہی صورت حال ایسی تھی تو غالب کا اپنا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ غالب اس سبکی کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو آغا میر سے مدعیِ ملاقات کی بنا پر پیش آئی تھی۔ غالب نے مذکورہ بالا خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا، درست نہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

اگر ہم غالب کے اس بیان کو درست مان لیں کہ لکھنؤ میں ان کا قیام پانچ مہینے یا پانچ مہینے سے دو چار دن زیادہ رہا تو غالب کو دسمبر ۱۸۲۶ء یا جنوری ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچنا چاہیے مگر یہ تاریخیں تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء (شاہ اودھ اور گورنر جنرل کان پور میں ملاقات کی تاریخ) کو غالب لکھنؤ میں تھے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ غالب نومبر کے مہینے میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے تو لکھنؤ میں غالب کے قیام کو کم سے کم آٹھ مہینے ہو جاتے ہیں۔ امکان یہ ہے کہ وہ نومبر سے ایک دو مہینے پہلے پہنچے ہوں گے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو غالب پانچ مہینے سے آٹھ نو مہینے تک لکھنؤ میں رہے تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان کا قیام اور بھی زیادہ مدت کے لیے رہا ہو۔ (۴۴)

غالب نے جس طرح پنشن کی درخواست میں مصلحتہً کلکتے کے سفر سے پہلے فیروز پور سے دہلی آنے کا ذکر نہیں کیا اسی طرح ان کا یہ بیان کہ وہ لکھنو میں پانچ ماہ سے کچھ اوپر مقیم رہے کسی مصلحت پر مبنی ہے۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب لکھنؤ جانے کے کچھ عرصہ بعد بیمار ہوئے ہوں تو انہوں نے خط میں صرف اپنی بیماری کا دورانیہ پانچ ماہ ظاہر کیا ہو۔ سردست یہ محض قیاس کی حد تک کہا جا سکتا ہے۔

غالب جب لکھنو سے سفر کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو چلتا را پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ:

> بنارس میں قیام کرنے کی بجائے الہ آباد پہنچ کر چند دن آرام کر کے اور سفر کی ضروریات بہم کر کے سفر پر روانہ ہو جاؤں اور سوائے مرشد آباد بنگال کے کسی جگہ قیام نہ کروں۔۔۔ بدھ کے روز، دوپہر کے وقت نا خدا کی جگہ خدا پر بھروسا کر کے کشتی میں سوار ہو گیا۔ (۲۵)

لیکن الہ آباد غالب کو راس نہیں آیا اور وہاں ان کا قیام صرف ایک دن رہا۔ اس بارے میں غالب لکھتے ہیں:

> افسوس الہ آباد! اس ویرانے پر خدا کی لعنت برسے کہ وہاں نہ تو بیمار کے لیے دوا ملتی ہے اور نہ کسی مہذب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے۔۔۔ اس کے لوگوں میں نہیں اور محبت و حیا وہاں کے پیرو جواں میں نایاب ہے۔ اس کے نواح و اطراف دنیا کے لیے سرمایہ روسیاہی اور اس کی ویران آبادی۔۔۔ دو منزلہ۔۔۔ اس ہولناک وادی کو شہر کہنا سراسر ناانصافی ہے اور اس بھوتوں کی بستی میں کسی انسان کا رہنا کیسی بے حیائی ہے۔ (۲۶)

مالک رام نے غالب کے ادبی معرکے کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے۔ پہلا الہ آباد میں، دوسرا کلکتے میں۔ الہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ (حاشیے میں مالک رام نے اس شعر

کی طرف اشارہ کیا ہے جو کلیات نظم فارسی کے قصیدہ نہم در منقبت سید الشہدا علیہ السلام میں شامل ہے:

نفس بلرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ   نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد (۲۷)

اس ضمن میں قاضی عبدالودود مالک رام کی کتاب ''ذکر غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> غالب کے اس شعر کی بنا پر (مالک رام) نے لکھا ہے کہ سفر کلکتہ میں غالب کے خلاف ایک ہنگامہ الہ آباد میں بھی ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح غلام امام شہید سے تھا۔ میں اس وقت تک یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ ''ہنگامہ الہ آباد'' سے غالب کی کیا مراد ہے لیکن یہ شعر کلیات فارسی طبع اول میں موجود ہے۔ (۲۸)

خلیق انجم اس موضوع پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> غالب جس دن الہ آباد پہنچے تھے ممکن ہے اسی دن کوئی ادبی محفل منعقد ہوئی اور اس محفل میں غلام امام شہید شریک ہوئے ہوں۔ شہید قتیل کے شاگرد تھے۔ ممکن ہے غالب کی شہید یا کسی اور سے تلخ کلامی ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس تلخ کلامی میں شہید نے قتیل کی تعریف کی ہو یا ان کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے ہوں۔ لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔ اس کے لیے شواہد موجود نہیں۔ (۲۹)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مقالے ''غالب اور سرسید احمد خاں'' میں ایک فارسی خط نقل کیا ہے کہ جس زمانے میں (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۶ء) میں سرسید احمد خاں فتح پوری سکیری میں منصف تھے۔ انھوں نے مرزا غالب کو ایک خط لکھا تھا جس میں غلام امام شہید کے دو اشعار بھیجے تھے کہ ان کو تضمین کر دیا جائے۔ یہ بات غالب کی طبع نازک پر سخت گراں گزری۔ وہ قتیل کے شاگرد کو کب اس مرتبے کا سمجھتے تھے کہ ان کے اشعار کی تضمین کریں۔ اس سلسلے میں غالب نے جو خط سرسید احمد خاں کو لکھا ہے۔ وہ ملاحظہ ہو:

بنام جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر منصف فتح پور

نواب معلی القاب و سید عالی جناب سلامت،

بعد رسیدن منشور رافت نشاں شادماں شدم و از اں چہ مرا بسر انجام آں فرماں دادہ اند غمیں، یک دو بیت از دیگرے گرفتن و بر آں گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئین سخن وری و کدام شیوۂ معنی پروری است۔ خاصۂ ایں دو بیت کہ جز شکوہ الفاظ تازی ہیچگونہ معنی نازک ندارد و سیما در بحرے واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیاں دراں بحر غزل نگفتہ، انچہ بریں دو بیت افزائید خواہی آں را مسدس نام نہند و خواہی ترجیع بند خوانند ، خاص از بہر آنست کہ گدایاں یاد گیرند و بر درہا بآہنگ حزیں بخوانند۔ کدام عاشق خاتم المرسلین بسماع ایں اشعار از خود رود و گریباں درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالی ہر چہ گفتہ اند و خوشتر ازیں نتواں گفت، لیکن ایں شاعری و سخن پروری نیست، چیزے دیگر ہست کہ در مجلس مولود شریف تواں خواند۔۔۔۔اس خط کے تیور بتاتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کی یہ فرمائش غالب کی طبع نازک پر گراں گزری۔ (۳۰)

خلیق انجم نے محمد علی خاں کے نام غالب کے خط کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

اس میں یہ فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں "شائستہ مردم بزم" بھی نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ الہ آباد میں ایسے لوگ نہیں جو محفل میں شریک ہونے کے قابل ہوں ۔ یہ بات تو اس وقت کہی جا سکتی ہے، جب الہ آباد کی کسی محفل میں غالب کے ساتھ کسی کا رویہ غیر شائستہ یا غیر مہذب رہا ہو۔ (۳۱)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہنگامہ کلکتہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی غالب قتیل سے نفرت کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نفرت کی ابتدا الہ آباد ہی سے ہوئی ہو اور اس کا سبب مولوی امام شہید ہو۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں یقیناً ناگوار فضا قائم ہوئی ہوگی جس کی بنا پر انہوں نے الہ آباد میں طویل قیام کی خواہش کو ترک

کر دیا اور وہاں سے جلد آگے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کلکتہ کے مشاعروں کے ضمن میں سفیر ہرات کے بارے میں بھی غالب کے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ کہیں اس کی حاضری پہلے مشاعرے میں ہے، کہیں دوسرے اور کہیں وہ کسی مشاعرے میں بھی حاضر نہیں ہوئے۔ ایک جگہ غالب لکھتے ہیں:

> یہاں کی اہم خبروں میں سے یہ ہے کہ اس شہر کے سخن سنجوں اور نکتہ رسوں نے فدوی کے یہاں پہنچنے کے بعد ایک بزمِ سخن مرتب کی تھی کہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو سارے شعراء اور سخن فہم حضرات سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوتے اور غزلیں پڑھتے اور سنتے تھے۔ اتفاقاً بادشاہ ہرات کا ایک سفیر بھی، خدا اس کو آفات سے محفوظ رکھے، جو یہاں آیا ہوا ہے، اس محفل میں آ پہنچا اور اس جائے عالی نے فارسی گویوں کے اشعار سنے۔ میری اس نے بڑی شدومد سے تعریف کی، اور کہا کہ اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کرسکے گا۔ آپ کا کلام تو اس لائق تھا کہ فصحائے ایران سنتے اور سر دھنتے۔ پھر اس نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا، دوستو، یہ ایک شخص تم لوگوں میں غنیمت ہے اور شعروشاعری سے قطع نظر زبان فارسی کا عالم ہے۔ (۳۲)

کلکتہ کے مشاعرے میں جب غالب پر اعتراضات ہوئے تو غالب نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی ٹھان لی اور مشاعرے کی تیسری نشست میں انہوں نے جواب دیے۔ اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ۔۔۔قدرت نے اپنا انتظام (پہلے سے) کر رکھا تھا اور حق اہلِ حق کی حمایت کے لیے بڑے اچھے انداز میں ظاہر ہوا۔ یعنی اُن دنوں میں خاصانِ عجم میں سے ایک مقتدر شخص، جو سفارت پر ایران سے آیا ہوا تھا، بانیانِ مشاعرہ کی دعوت پر اس محفل میں موجود تھا۔ اس ان سب لوگوں کے اشعار سنے اور جب میری باری آئی تو باوجود عدمِ تعارف کے اس کی ساری توجہ

میری طرف ہو گئی اور اس نے میرے لیے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا۔ شاید ان ایرانیوں نے، جو اس سے بیش تر ملتے میں تھے، اس کے سامنے میری نغز گوئی کی تعریف کی ہو۔ جب اس نے میرا کلام سنا اور اسے میرا تخلص معلوم ہوا۔ کہنے لگا، تیرے کلام میں بہت زور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو سب لوگوں پر غالب ہے اور اسم با مسمّٰی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اہل بزم کی طرف رخ کیا اور کہا، دوستو تم لوگوں کے درمیان یہ نفس گداختہ اور خوش نوا غنیمت ہے۔ اس شخص کی قدر کرو کہ شعر و شاعری سے قطع نظر یہ (شخص) فارسی زبان کا عالم (بھی) ہے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے میرے نطق کا گھوڑا ابد کا اور اس نے میدان حق جوئی میں فتنے کی گردن اڑا دی۔ میں نے جب اعتراضات کا جواب دینے کو زبان کھولی تو سفیر مذکور میرا ہم زبان ہو گیا اور اس نے میری توصیف کرنا اور ان لوگوں پر ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔(۳۳)

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ غالب نے سفیر ہرات سے اپنے متعلق جو توصیفی اور تعریفی کلمات منسوب کیے ہیں ان کے مطالعے سے سید لطیف الرحمٰن کا اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں تھا ۔وہ غالب کے بارے میں سفیر ہرات کے تاثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غالب نے اپنے اور دوسرے شعرائے ہند کے بارے میں کفایت خاں کے تاثرات کو جس مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کفایت خانی تاثرات غالب صاحب کی ذہنی تخلیقات ہیں اور خود کفایت خاں عبدالصمد نمبر ۲ ہے اس فقرے سے کہ "یہ شخص پارسی زبان کا عالم ہے، تخلیق کا راز فاش ہو جاتا ہے۔(۳۴)

اس ضمن میں خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب نے تین مشاعروں میں سے کم سے کم ایک مشاعرے میں سفیر ہرات کی موجودگی بتائی ہے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں غالب لکھتے ہیں:

قضارا اس زمانے میں شہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔

> کفایت خاں اس کا نام تھا۔اس تک یہ قصہ پہنچا۔اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے۔۔۔(۳۵)

غالب کے اس بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سفیر ہرات کسی بھی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے بلکہ کسی اور شخص نے ان کو یہ قصہ سنایا تھا۔خلیق انجم لکھتے ہیں کہ میں نے سفیر ہرات کے بارے میں بہت تحقیق کی لیکن ان کے بارے میں کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ سفیر ہرات بھی عبدالصمد کی طرح غالب کی تخلیق ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

> میں سید اکبر علی ترمذی صاحب کا شکرگزار ہوں،جنہوں نے نیشنل آرکائیوز دھلی میں محفوظ دو دستاویزوں کے حوالے سے بتایا کہ سفیر ہرات کا پورا نام سید حسین علی خاں معروف بہ کفایت خاں،وکیل والئی ہرات تھا اور وہ کلکتے میں گورنر جنرل کے ۱۶ جولائی کے دربار میں موجود تھے۔(۳۶)

اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

> غالب نے ادبی معرکے سے متعلق کسی ایک مشاعرے میں سفیر ہرات کی موجودگی کی تفصیل بیان کی ہے۔ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی معرکے کے پہلے مشاعرے میں سفیر ہرات شریک تھے اور کہیں پتا چلتا ہے کہ وہ تیسرے مشاعرے میں موجود تھے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معرکے کے اڑتیس سال بعد غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ سفیر ہرات مشاعرے میں شریک نہیں تھے بلکہ کسی نے انھیں اس معرکے کی تفصیل بیان کی تھی۔سفیر ہرات نے سند کے طور پر پانچ سات اشعار پڑھے جو بقول غالب "قاطع برہان" میں مندرج ہیں۔(۳۷)

غالب فن تاریخ گوئی میں اپنے آپ کو "بیگانہ محض" سمجھتے تھے اور اس کا اظہار دوستوں سے خطوط کے ذریعے کرتے رہے ہیں لیکن دوسری طرف فن تاریخ کے متعلق اپنے

خیالات کا اظہار خطوط کے ذریعے بھی کرتے رہے ہیں۔ خطوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کیسے انداز سے تاریخیں برآمد کرتے رہے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے کتنا لگاؤ تھا۔

غالب میاں دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں:

> تمھاری جان کی قسم کہ میں فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب سے درست نہ پاؤں گا۔ (۳۸)

اصل میں غالب فن تاریخ گوئی کو پست درجے کا فن سمجھتے تھے۔ میرزا تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> فن تاریخ کو دون مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔ (۳۹)

کسریٰ منہاس کا مقالہ بعنوان ''غالب کی تاریخ گوئی'' میں مقالہ نگار نے غالب کی چالیس تاریخیں درج کی ہیں جن میں اردو تاریخوں کی تعداد نو ہے۔ وہ غالب کی تاریخ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سالم الاعداد تاریخیں غالب نے اتنی نہیں کہیں جتنی دوسری وضع کی جن کا تعلق قطعہ تاریخ کے محض ایک مصرعے سے نہیں ہے اور جن پر گمان کیا جاسکتا ہے کہ پورا قطعۂ تاریخ خود غالب نے ہی کہا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ غالب نے سالم الاعداد تاریخیں سرے ہی سے نہیں کہی ہیں۔ اصل میں غالب نے ہر وضع کی تاریخ کہی

ہے۔ بعض صورتوں میں پورے ایک مصرع سے تاریخ برآمد ہوئی ہے۔ بعض اوقات گھٹانے اور جوڑنے کے بیک وقت عمل سے تاریخ نکالی گئی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم غالب کو تاریخ گوئی میں عاجز خیال کریں اور یہ سمجھیں کہ وہ اس بات کے محتاج تھے کہ مادۂ تاریخ ان کو کوئی نکال کر دے دے تو وہ تاریخ کہیں ورنہ نہ کہیں۔ غالب کی تاریخوں کے مطالعے سے ہمیں کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہوتی۔ انھوں نے ہر قسم کی تاریخیں نکالی ہیں اور اپنی جدت فکر سے اس صنف سخن کو چار چاند لگائے ہیں۔ (۳۰)

حقیقت میں غالب تاریخ گوئی کے فن کو اہمیت نہ دیتے تھے اور اسے ضمنی حیثیت دیتے تھے۔ ان کا کبر نفس بھی پسند نہ کرتا تھا کہ وہ اس فن میں مشہور ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی انا یہ گوارا نہ کرتی ہو کہ تاریخ ادب میں اس کا نام تاریخ گوئی کے حوالے سے لیا جائے۔

غالب نے بارہا اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر فخر کیا ہے۔ انھوں نے اشعار میں بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری فارسی شاعری "نقش ہائے رنگ رنگ" ہے اور مجموعۂ اردو "بیرنگ" ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

دوسری طرف دوستوں سے ریختہ کی داد کے بھی طلب گار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک خط میں نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں، سو وہ کبھی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے، کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے (۴۱)

مولوی ضیاالدین خان ضیا دہلوی کو لکھتے ہیں کہ اردو میں عربی فارسی سے سوا مزا ہے:

فارسی وعربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔ سبحان اللہ، وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا، نہ نری عربی میں وہ ذوق۔ (۴۲)

اسی طرح ریختہ کے بارے میں ایک خط میں نبی بخش حقیر سے استفسار کرتے نظر آتے ہیں:

بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (۴۳)

ایک اردو شعر میں بھی اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غالب میرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

غالب کے ان متضاد بیانات میں ایک نفسیاتی الجھن نظر آتی ہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ میرے فن کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہو سکی۔ شاید میرے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد میرے فن کی قدر ہو۔ غالب اپنے معاصر شعرا، خاص طور پر ذوق کو اپنے مرتبہ کا شاعر نہیں مانتے تھے جبکہ ذوق کو استادِ شہ کا مرتبہ حاصل تھا۔ لہذا غالب کے اس اظہار میں معاصرانہ چشمک کو دخل حاصل ہے۔ اپنی ناقدری پر ان کا دل دکھتا تھا لہذا وہ اردو کی بجائے فارسی شاعری میں پناہ ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ جب بھی کوئی فارسی اور اردو شاعری کا ذکر کرتا ہے تو غالب کا مذکورہ فارسی شعر نقل کیا جاتا ہے۔ یہ شعر غالب کے انیس ۱۹

اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کا ہے۔

اس قطعہ کا مطلع ہے:

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن ایں گفتہ
کے بہ پر گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است

اس قطعے کے بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

اس قطعے کے تمام اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب کوئی ایسا شاعر ہے جو اردو میں شعر کہتا ہے اور اسے بادشاہ سے قربت حاصل ہے۔ بظاہر ایسے شاعر ذوق ہی تھے۔(۴۴)

سید حامد صاحب نے اپنے مضمون ''غالب کی فارسی غزل' میں اس انیس اشعار کے قطعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

غالب نے اپنی اردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا ہے۔ دراصل بات کا محل ذوق سے چشمک تھی۔ غالب کا دل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استاد شہ کو دربار شاہی میں دی جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایہ افتخار ہے میرے لیے باعث عار ہے۔۔۔ غالب نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اسے غالب کی معاصرانہ چشمکوں اور قلعہ معلی میں ذوق کو حاصل ہوئی عزت اور اہمیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر ہم کہیں کہ غالب اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں واقعی بے رنگ اور حقیر سمجھتے تھے تو یہ غالب کی سخن فہمی، شاعرانہ صلاحیت اور ان کی عقل کو گالی دینا ہے۔ وہ اپنی اردو شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ انھوں نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں کہا تھا

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کا ایک اور شعر سنیے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
جو شاعر اپنے کلام کو بے رنگ سمجھتا ہو، کیا وہ یہ شعر کہہ سکتا ہے؟(۳۵)

غالب ہمیشہ اپنی انا کے خول میں مقید رہا ہے۔ غالب کی انگلی ہمیشہ وقت کی نبض پر رہتی تھی۔ حالات کی تبدیلی کے ادراک میں وہ انتہائی زیرک تھے۔ وقت کی کروٹ سے پہلے ہی وہ اپنے آپ کو نئے تناظر میں ڈھال لیتے تھے۔ صورت حال تبدیل ہونے پر وہ اپنے قصائد کے ممدوحین کو بھی تبدیل کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ امجد علی شاہ کے انتقال (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کے بعد میکش نے غالب کو مشورہ دیا کہ جو قصیدہ انھوں نے امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا تھا وہ واجد علی شاہ کے نام منسوب کر دیا جائے۔ غالب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا۔

انھوں نے اس کے جواب میں نومبر ۱۸۴۸ء کو میکش کو لکھا:

> تم نے جو کچھ بطور اطلاع لکھا تھا وہ دل غم زدہ کے لیے باعث شادمانی ہوا لیکن جو کچھ میرے لیے بطریق حکم مرقوم تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور اس سے میرے سودائی دل کو کسی قدر پریشانی ہوئی۔ میرا دیوان فارسی [مطبوعہ ۱۸۴۵ء] دہلی سے مدارس اور حیدر آباد تک اور لاہور سے ہرات و شیراز تک پہنچ چکا ہے۔ شاہِ جنت آرام گاہ [امجد علی شاہ] کی مدح کا قصیدہ [شادم کہ گردش سزا کرد روزگار] اس میں درج ہے اور ایک دنیا اس کو دیکھ چکی ہے۔ یہ ننگ اپنے اوپر کیسے روا رکھوں کہ اسے کسی دوسرے کے نام کر دوں۔(۳۶)

غالب کی خواہش تھی کہ ملکہ انگلستان کو ''دستنبو'' کے ساتھ قصیدہ بھی بھیجا جائے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قصیدہ کتاب کے شروع میں چھپے اور اُوپر لکھا ہو ''قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلد اللہ ملکہا''۔ اس قصیدے کے بارے میں غالب نے حاتم علی مہر کے نام ایک

خط لکھا:

میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے۔(۴۷)

اسی طرح غالب میاں دادخاں سیاح کو اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں:

۔۔۔''دستنبو'' میں نے نذر کی، ''مہر نیم روز'' معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ جو ''دستنبو'' میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔(۴۸)

مذکورہ بالا خطوط میں غالب نے قصیدہ لکھنے کے بارے میں جو کہا ہے درست نہیں ہے۔ ملکہ معظمہ کی مدح میں قصیدے کے بارے میں تقریباً یہی باتیں غالب نے ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو بھی لکھی تھیں کہ انھوں نے یہ قصیدہ انہی دنوں میں کہا ہے۔ اس کی پردہ کشائی کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ ظفر کی طویل بیماری کے بعد غسل صحت کے موقع پر کہا تھا۔(۴۹)

غالب نے اس قصیدے میں سے کچھ اشعار نکال کر اور کچھ لفظی تبدیلیاں کر کے اسے ملکہ معظمہ کی مدح میں کر دیا تھا۔ ساٹھ اشعار کے اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار ہانتوانند شمار یافت
خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ:

مالک رام صاحب نے جب مطبوعہ کلیات غالب کا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ایک قلمی نسخہ کلیات غالب سے موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ مطبوعہ نسخے

میں پانچ قصیدے ایسے ہیں جن کے ممدوح پہلے بہادر شاہ ظفر تھے لیکن بعد کو غالب نے ان قصیدوں میں ضروری ترمیم وتنسیخ کر کے انھیں دوسرے ممدوحین سے منسوب کر دیا۔(۵۰)

اسی بیان سے ملتا جلتا بیان سید قدرت نقوی کا بھی ہے کہ:

غالب نے کئی قصیدوں میں تبدیلی کر کے بعض انگریزوں کے نام کر دیے تھے۔ گویا پرانے قصیدوں میں ترمیم واضافہ کر کے نئے ممدوحین کے سامنے پیش کر دیا۔(۵۱)

''پنج آہنگ'' میں ایک خط شمس الامراء نائب والی حیدر آباد کے نام ہے۔ اسی خط کے بارے میں سید وزیر الحسن عابدی لکھتے ہیں:

اس خط میں غالب نے کہا ہے کہ میں کم وبیش تیس سال سے فارسی میں شعر کہہ رہا ہوں۔ خط کے آخر میں جس قصیدے کے شروع کے دو شعر ہیں وہ وہی قصیدہ ہے جو کلیات میں ۵۶ واں ہے اور نواب وزیر محمد خان والئی ٹونک کی مدح میں ہے۔ دراصل یہ قصیدہ شمس الامراء کی مدح میں تھا، جس کے شروع کے مذکورہ دو شعر نکال کر ان کے بجائے پانچ شعر بڑھا کر قصیدہ دوسرے ممدوح کے نام کر دیا گیا۔ راقم کے پاس غالب کے ایک معاصر میر فرحت اللہ خاں (غلام علی خان وحشت کے والد) کی بیاض ہے جس میں انھوں نے صرف غالب کا فارسی کلام جمع کیا ہے۔ اس میں قصیدہ اپنی سابقہ اصلی صورت میں ہے۔ غالب کے دیوان فارسی، کتابت شدہ ۱۸۴۱ء میں بھی یہ قصیدہ ان الفاظ میں درج ہے۔ ''بعنوان روشنگری آئینہ سخن بہ چشمداشت قبول از شمس الامراء نواب محمد رفیع الدین خان بہادر نائب والئی حیدرآباد۔(۵۲)

اسی طرح وقت کے نئے تناظر میں غالب نے اپنے اشعار میں بھی رد وبدل کیا۔ سفر کلکتہ میں، قیام لکھنو کے دوران گیارہ اشعار کی ایک غزل کہی تھی۔ جس کا آخری شعر:

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادہ رہ، کشش کاف کرم ہے ہم کو

ہے مگر جب غالب کی معتمد الدولہ سے بگڑ گئی تو آخری شعر کے پہلے مصرع سے معتمد الدولہ کا نام نکال کر اسے مقطع کر دیا۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادہ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

قیام کلکتہ میں غالب نے ایک مثنوی لکھی تو اس کی تخلیق کے وقت اس کا نام ''آشتی نامہ'' رکھا لیکن بعد میں بدل کر ''بادمخالف'' رکھ دیا۔ اسی طرح غالب نے بعد میں مثنوی میں ایک شعر کا اضافہ بھی کر دیا۔ اس کے بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

غالب کے مروجہ فارسی دیوان میں شامل مثنوی ''بادمخالف'' میں ایک شعر ہے:

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را

(جس شخص نے (شاعری میں) یہ منزلیں طے کی ہوں وہ قتیل اور واقف کو کیا گردانے گا) دلچسپ بات یہ ہے کہ بادمخالف کی اولین روایت میں یہ شعر نہیں ہے۔۔۔ وہ شعر جو مروجہ روایت میں ہے، یقین ہے کہ کلکتہ سے واپسی کے بعد بڑھایا گیا ہے۔ (۵۳)

سرسید احمد خاں نے جس وقت ابوالفضل کی معرکہ آرا تصنیف ''آئین اکبری'' کی تدوین کر کے شائع کرنا چاہا تو غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ بات غالب کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سرسید نے ''آئین اکبری'' کو مرتب کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ غالب کا خیال تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت، تہذیب و تمدن اور ایجادات کے ضمن میں جو آئین رائج کیے، ان کے مقابلے میں آئین اکبری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اب اگر ادب و انشا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب کے نزدیک ''آئین اکبری'' اس میزان میں بھی

بہت سبک ٹھہرتی تھی۔ غالب نے سرسید کی فرمائش پر ۳۸ ابیات پر مشتمل تقریظ لکھ تو دی لیکن سید احمد خان نے اس کو شاملِ کتاب نہ کیا۔ اسی تقریظ میں ایک بیت ہے:

طرز تحریرش اگر گوئی خوش است
نے فزون از ہر چہ می جوئی خوش است

"اگر تم یہ کہو کہ اس کا طرز تحریر اچھا ہے تو وہ بھی کچھ ایسا اچھا نہیں۔"

اصل میں غالب خود آئین اکبری کے اسلوب کے مقلد تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں:

> مرزا نے "آئین اکبری" کے "طرز تحریر" کی مذمت کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوالفضل ہی نے انھیں راستہ دکھایا ہے اور انہوں نے آئین اکبری ہی کے ساز و سامان سے اپنا گھر (اسلوب پنج آہنگ) سجایا ہے۔ ان پر تھوڑا سا پرچھانواں بیدل کا بھی پڑا ہے۔ (۵۴)

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے آئین اکبری کے اسلوب نگارش کی آٹھ اہم خصوصیات کو غالب کی پنج آہنگ میں بھی خوب تلاش کیا ہے۔ فاضل محقق نے دونوں تصانیف کا تقابلی موازنہ کیا ہے اور تقریباً دو سو کے قریب الفاظ کی مماثلت بھی دکھائی ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> مرزا غالب نے ابوالفضل کی جدت طرازی سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور "آئین اکبری" کی روش خاص کے بنیادی عناصر کو اپنی تحریر کی اساس ٹھہرایا ہے اور اس طرح اپنے لیے دوسروں سے ایک الگ راہ نکالی ہے۔ لیکن بہر حال ان کا راہ نما ابوالفضل ہی ہے اور آئین اکبری ان کا چراغ ہدایت۔ یہ بات الگ ہے کہ انھوں نے اپنی انانیت کی بنا پر ابوالفضل سے استفادے کا اعتراف نہیں کیا اور ابوالفضل کے "طرز تحریر" کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ (۵۵)

غالب نے نواب کلب علی خاں کو ایک بلا ضرورت مشورہ دیا کہ اگر آپ مناسب

سمجھیں تو ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ اپنے لیے خطاب حاصل کریں۔نواب موصوف نے اس کا برا منایا اور غالب سے ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔باوجود ضعف و بیماری غالب ۱۸۶۵ء کے جشن کے لیے رام پور گئے تا کہ تلافیِ مکافات کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔مالک رام لکھتے ہیں:

> غالب نے نواب کو متاثر کرنے کے لیے غزل
>
> دائم پڑا ترے در پہ نہیں ہوں میں
>
> اور
>
> غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
> وہ دن گئے کہ کہتے تھے ''نوکر نہیں ہوں میں
>
> کو بدل کر اس طرح لکھ کر بھیجا
>
> در پہ امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
> شائستہ گدائی ہر در نہیں ہوں میں
> بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں ہوں میں
> خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں (۵۶)

قصائد کے ممدوحین کی تبدیلیاں اور دوسری تحریفات میں غالب کی مصلحت پسندی اور مطلب برآوری پوشیدہ ہے۔جو قصائد بار آور نہ ہو سکے یا ایسی نوبت ہی نہ آسکی ان کو دوسرے ممدوحین کے نام کر دیا۔لہذا یہاں بھی غالب کی انا مجروح نہیں ہوئی بلکہ یہ اقدام بھی تحفظِ انا کے ضمن میں تھا۔حالی نے ''یادگار غالب'' میں مثنوی '' مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبین'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> چوں کہ مولانا (فضل حق خیر آبادی) کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی۔انھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو۔۔۔۔۔لاچار مرزا نے ایک مثنوی، جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے، لکھ کر مولانا

کوسنائی۔(۵۷)

حالی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا کو مثنوی کا آخری شعر:

در یکے عالم دو خاتم تا دا بجوے
صد ہزار عالم و خاتم بگوے

ناپسند آیا اور اسے نکالنے کے لیے اصرار کیا۔ مرزا نے حکم کی تعمیل کی جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے، اس کو اسی طرح رہنے دیا، مگر اس کے آگے چند اشعار کا اضافہ کر کے مضمون پھیلا دیا۔ بعد میں آنے والے غالب کے معروف سوانح نگاروں بشمول مالک رام لکیر کے فقیر بن گئے اور حالی پر ہی اعتماد کر کے دھوکا کھاتے گئے۔ یوں غلطی در غلطی کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو تقریباً تا حال جاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کا مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مثنوی ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور اس وقت مولانا موصوف کے علمی حریف شاہ اسماعیل دہلوی کو فوت ہوئے اکیس سال گزر چکے تھے۔

نور الحسن راشد کاندھلوی نے اپنے مقالے میں اس مثنوی کی تحریر اور اشاعت کے سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حقی) دہلوی کی تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیل ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم و مرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلی شاہ جہاں آبادی (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت ۔بارے وابستا اور "مہر نیم روز" کی ترتیب میں مشغول تھے، اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیل ارشاد ہوئی

> اور غالب نے اس مضمون کو نظم کر کے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گزارا۔ بہادر شاہ کو یہ ترتیب اور ترجمانی بہت پسند آئی۔۔۔۔۔۔ بہادر شاہ نے اس کی فوراً طباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ (۵۸)

اس مثنوی کا پورا نام ''بیان نموداری شان و نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار الوہیت است'' ہے اور عام طور پر مثنوی شان نبوت ولایت کے نام سے معروف ہے۔ ابتدا میں جب یہ مثنوی نظم ہوئی تو ایک سو ایک (۱۰۱) اشعار پر مشتمل تھی بعد میں کہیں غالب نے اس کے آخری تین شعر حذف کر کے تیس (۳۰) اشعار کا اضافہ کر دیا۔ حالی نے (جیسا کہ متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے) لکھا ہے کہ آخر کے تیس اشعار بڑھانے میں مولوی فضل حق کا ہاتھ ہے، درست نہیں ہے۔ اس بارے میں کالی داس گپتا لکھتے ہیں:

> مثنوی کی روایت اول کے ۱۰۱ اشعار میں سے تین شعر حذف کر کے تیس (۳۰) شعر بڑھانے کا عمل اگر مولانا فضل حق خیر آبادی کی شہ پر روا رکھا گیا ہوتو ہو۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ اشعار قلم زد کرنے اور ۳۰ اشعار کا اضافہ کرنے میں بھی مولانا فضل حق خیر آبادی کا ہاتھ نہیں کیوں کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی واپس انگریزی فوج کے قبضے میں آیا۔ گویا ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب کہ بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہندوستان تھا، غالب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شعر:
>
> بر دعاے شہ سخن کو تاہ باد
>
> تا خدا باشد بہادر شاہ باد
>
> مثنوی سے خارج کر دیا جائے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ اگست ۱۸۵۲ء اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان فضل حق خیر آبادی دہلی میں رہے ہی نہیں تھے۔ وہ رام پور میں آٹھ سال رہ کر ۱۸۴۷ء میں یہیں سے لکھنو چلے گئے اور شاہ اودھ کی معزولی تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔۔۔ یہ شعر ''بر دعاے شہ۔۔۔ دیوان غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء (مثنوی سرمہ بینش) میں

شامل ہے۔ لہٰذا قابلِ غور بات یہ ہے کہ ۱۸۴۵ء کا چھپا ہوا یہ شعر ۱۸۵۴ء کی مثنوی میں کیوں شامل کیا گیا۔ میری رائے میں غالب نے مولانا محمد سالم کی تحریر کا منظوم ترجمہ دل جمعی سے نہیں کیا تھا۔ اس میں شاہ کی مدح میں پہلے ہی کا کہا ہوا شعر آخر میں چسپاں کر کے فراغت پالی مگر جب اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر دیا گیا تو غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظرِ ثانی کی اور تین شعر حذف کر کے اور تین شعر بڑھا پوری مثنوی چھپالی۔ پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیاتِ فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی۔(۵۹)

غالب کو ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئی اور بقول حالی غالب کی اسیری برائے نام تھی اور قید خانے میں انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ غالب نے بھی اپنے ایک فارسی خط میں تفضل حسین خاں کو اپنی قید کے حوالے سے حالی سے ملتا جلتا انداز ہی اپنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

۔۔۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ جب (قید کی) ساری معیاد ختم ہونے کو آئی تو مجسٹریٹ کا دل پسیجا اور اس نے صدر عدالت سے خود اپنے حکم کی تنسیخ اور میری رہائی کی درخواست کی۔ درخواست منظور ہوئی بلکہ اس کی اس خواہش کی تعریف کی گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرآوردگان قوم نے اس سر پھرے یعنی نا انصاف مجسٹریٹ کو ملامت کیا اور میری آزادہ روی اور خاکساری اس پر واضح کی۔ (اور یہ سب) اس طور پر کہ (بالآخر) اس نے میری رہائی کی درخواست خود ہی کی، معذرت (بھی) کی اور اس کے علاوہ بھی معافی، تلافی اور دل جوئیاں کرتا رہا۔۔۔'(۶۰)

اصل میں اسیری کی سبکی سے غالب کا دل دکھا ہوا تھا۔ بدنامی کے اس داغ کو دور کرنے اور اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے غالب نے دورانِ قید "حبسیہ" بھی لکھا اور اس میں ان کی انا پھر سر اٹھانے لگی۔ اس ضمن میں بھی غالب نے "حبسیہ" میں مبالغے سے کام لیا ہے

اور ’’جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے‘‘ والا انداز اپنایا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

> غالب جوئے کے الزام میں قید ہوئے تو حبسیہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زندان خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔(۶۱)

غالب کی اسیری کے بارے میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> غالب کی بیان کردہ تفاصیل متضاد بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں۔ وہ اس موقف پر مُصر تھے کہ قمار بازی کا قصہ محض غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور انہیں سہواً سزا دی گئی۔ اپنی اسیری کے بعد غالب اس کی تفصیل میں دانستہ طور پر اخفا برتتے رہے ہیں۔ گھنشام داس عاصی کی معاصر شہادت غالب کے اس بیان سے مختلف ہے۔ عاصی کے مطابق جیل میں برے حال تھے۔ ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ کپڑوں میں جوئیں پڑ چکی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر سول سرجن نے طبی بنیادوں پر غالب کی قبل از وقت رہائی کی سفارش کی تھی۔(۶۲)

اس بارے میں حالی کے بیان پر تنقید کرتے ہوئے انیس ناگی لکھتے ہیں کہ غالب کو قید بامشقت ہوئی تھی۔ غالب کے حبسیہ سے گمان گزرتا ہے کہ غالب سے رسیاں بٹوانے کی مشقت بھی لی گئی تھی اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں انگریز حکام نے غالب سے بھی پوچھ گچھ کی۔ اس بارے میں غالب اپنی تصنیف ’’دستنبو‘‘ میں لکھتے ہیں:

> راجہ نرندر سنگھ کے سپاہی کا روکنا بے سود رہا (گورے) دوسرے چھوٹے مکانوں کو نظر انداز کر کے جہاں راقم الحروف تھا، آ پہنچے۔ اپنی خوبی مزاج کے سبب گھر کے اسباب کو چھوا تک نہیں اور مجھے ان دونوں مبارک شکل بچوں، دو تین نوکروں اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ پکڑ آئے گئے

اور چھوڑ دیا گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر اور وہ بھی درشتی یا سخت گیری کے ساتھ نہیں، معاملہ فہم اور دانش مند کرنل براؤن بہادر کے سامنے، جو چوک اس طرف، قطب الدین سوداگر کے مکان میں ٹھہرا ہوا ہے، مجھے لے گئے۔ کرنل نے میرے ساتھ نرمی سے بات کی اور مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا اور خوش نودی کے ساتھ اسی وقت گھر کو رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اس فجستہ خو کو آفریں کہی اور واپس آ گیا۔ (۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ غالب کو ابتدا میں خیال آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن ''دستنبو'' کی اشاعت سے قبل ان کے ذہن میں یہ خیال ضرور پیدا ہو چکا تھا کہ ''دستنبو'' کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔ خصوصاً اپنی بے گناہی اور اس وسیلے (دستنبو) سے پنشن کی بحالی کے لیے انہوں نے اس تالیف میں مصلحت سے کام لیا۔ لہٰذا انہوں نے اس موقع پر بھی ان (انگریز حکام) کو ''اپنی خوبیِ مزاج''، ''معاملہ فہم''، ''دانش مند'' اور ''فجستہ خو'' کہا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

غلام حسین خاں نے اپنی فارسی کتاب میں، جس کا ملخص ترجمہ ''غدر کا نتیجہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے، لکھا ہے کہ گورے غالب کو گرفتار کر کے کرنیل برن (کذا) کے پاس لے گئے، مرزا کی زندگی ابھی باقی تھی، ان کے ایک دوست اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، انہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوادی۔ (۶۴)

غالب نے انقلاب کے دوران مصلحت پسندی کا رویہ اپنائے رکھا اور حالات پر نظر رکھی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے حوالے سے نو اشعار کا ایک قطعہ بھی لکھا جس کا پہلا شعر ہے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا!

محققینِ غالب کی اکثریت نے اس قطعہ کو غالب کی حب الوطنی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ غالب کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ موجود تھا۔ لیکن وہ حالات کی بے یقینی اور اس کے جبر سے مجبور بھی تھے۔ اس انتہائی نازک وقت میں ان کا رویہ ایک مصلحت پسند کا رہا تھا۔ لہٰذا غالب کو یہ قطعہ کم از کم پانچ سال بعد منظرِ عام پر لانا پڑا۔ بقول ڈاکٹر۔ ظ۔ انصاری:

> ''غدر کے فرو ہو جانے کے بعد ۱۸۶۱ء میں ان کا دیوان اردو شائع ہوا تو اس میں یہ قطعہ شامل نہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا تھا۔'' (۶۵)

''دستنبو'' میں غالب نے ہر ممکن طریقے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہان تیموریہ سے ان کا تعلق برائے نام تھا اور وہ بھی محض تاریخ نویسی تک محدود تھا۔ حالانکہ ''مہر نیم روز'' میں غالب نے خود اپنے آپ کو شاہانِ تیموریہ کے خاندان سے منسلک کیا ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور ضعیفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ناچار ہفتے ایک دو بار قلعے جاتا اور اگر بادشاہ محل سے باہر آتا تو کچھ دیر خدمت میں کھڑا رہتا ورنہ دیوان خاص میں تھوڑی دیر بیٹھتا اور آتا اور جتنا کچھ اس دوران میں لکھ لیا ہوتا اپنے ساتھ لے جاتا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔ میں (ادھر) اس مصروفیات میں تھا اور (ادھر) چرخ تیز رفتار دور رس خیال میں کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور (میرا) یہ بے حقیقت سا آرام و اطمینان جو ہر قسم کی آلودگی سے مبرا تھا برباد کر دے۔ (۶۶)

اصل میں غالبؔ اس تالیف کے ذریعے حکام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ بادشاہ سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا وہ تو انگریز کے پنشن خوار اور خیر خواہ تھے۔ لیکن دوسری طرف غالب بہادر شاہ ظفر سے بھی تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔ اس بارے میں خطوط میں بھی غالب اپنی بے گناہی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ لیکن بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دربار میں
حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکہ بھی پیش کیا تھا
اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے
گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ (۶۷)

خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب نے دوران انقلاب تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے تھے۔ ایک ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر دوسرا ۳۱، جولائی ۱۸۵۷ء کو آگرہ کی فتح کی خوشی کے موقع پر، اور تیسرا ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو۔ غدر کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے انیس ناگی نے بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

اصل میں غالب کا ۱۸۵۷ء کے بارے میں رویہ اس عہد کے ایک مصلحت
پسند کا تھا جو بیک وقت انگریزوں اور انقلابیوں سے ڈرتا تھا اور کسی ایک کو
ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غالب انگریز حکومت کی مہربانیوں کے بارے
میں رطب اللسان ہیں اس کے باوجود غیر شعوری طور پر ان کی بربریت بھی
بیان کرتے ہیں۔ (۶۸)

غدر میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کو ایک انگریز سپاہی نے ۱۱۹ کتوبر ۱۸۵۷ء کو قتل کر دیا۔ غالب نے اس واقعہ کو بھی پردہ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی اور اپنی تصنیف ''دستنبو'' میں اس کی وفات کو طبعی ظاہر کیا۔ لکھتے ہیں:

۱۱۹ کتوبر کو وہی پیر کا دن، جس کا نام ہفتے کے دنوں کی فہرست سے کاٹ دینا
چاہیے، ایک سانس میں آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل گیا، اس
دن کے پہلے پہر میں وہ افسردہ، ژولیدہ مو دربان، بھائی کے مرنے کی بد
خبری لایا۔ کہتا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا پانچ دن تک تیز بخار میں جلتا رہا اور
رات کے وقت آدھی بجے توسن (عمر) کو اس تنگنائے سے کودا لے
گیا۔ (۶۹)

اس ضمن میں مالک رام نے بھی ''خدنگ غدر'' کے مصنف معین الدین حسن خان کا

بیان لکھا ہے کہ:

> میرزا یوسف خان کہ قدیم سے مجنوں تھے، گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے وہ بھی مارے گئے۔(۷۰)

غالب کو پنشن کی بازیابی کی جتنی فکر تھی اس سے زیادہ خلعت و دربار کی واگزاری کی خواہش تھی۔ غالب کے سوانح نگاروں بالخصوص غلام رسول مہر نے واشگاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں پنشن کے ساتھ ساتھ خلعت و دربار بھی واگزار ہو گئے۔ لیکن حالات و واقعات سے اس بیان کی صحت مشکوک سی ہو جاتی ہے۔ غالب کو کلکتے میں بھی خلعت و دربار کی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو محمد حبیب اللہ ذکا کو بھی لکھا کہ کلکتہ گیا، نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی۔ سات پارچے ۱ز رجیغہ، سر پیچ اور مالائے مروارید یہ تین رقم خلعت ملا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو خلعت نہیں ملا۔ یہ صرف ان کی آرزو تھی۔ مالک رام نے ''ذکر غالب'' میں ''دربار و خلعت کی بحالی'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

> بارے یہ کوشش پروان چڑھیں اور ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت بھی پھر سے جاری ہو گیا۔(۷۱)

غالب ایک جگہ خط میں لکھتے ہیں کہ لارڈ صاحب یہاں آئے اور اہل دفتر نے اطلاع دی کہ تمھارا دربار و خلعت واگزاشت ہو گیا۔ مگر دلی میں دربار نہیں، انبالے جاؤ گے۔ دوسری جگہ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ لارڈ ایلگن گورنر جنرل کے دربار انبالہ کی خبر اور اس میں شمولیت کی صلاح خود سر رابرٹ منٹگمری نے دی تھی۔ غالب پھر اپریل ۱۸۶۳ء کو تفتہ کو لکھتے ہیں:

> ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے، انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔(۷۲)

غالب نے تفتہ کو یہ بھی لکھا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ دوسری طرف انبالے نہ جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

> رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔ پھنسی پھوڑا ہوگئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔ زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست دہ گوشت مردار ہوگیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ (۷۳)

غالب نے ایک خط "اودھ اخبار" کو بھی لکھا جس میں ۱۸۶۳ء کو لفٹنٹ گورنر بہادر قلم رو پنجاب کے دہلی آنے اور غالب کو یاد فرمانے کا تذکرہ کیا ہے۔ اخبار مذکور میں خط سے پہلے منشی نول کشور کی یہ تحریر بھی درج ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ یہ تحریر بھی خود غالب نے لکھ کر بھیجی تھی۔ تحریر ملاحظہ ہو:

> قدر دانی حکام۔ بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے، ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی۔ کمال کی قدردانی کی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ زیادہ احتیاج بیاں ہے۔ ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے۔ (۷۴)

یہ تحریر مکمل طور پر غالب کے اسلوب بیاں کی غماز ہے۔ اس کا مقصد ہم چشموں کو نیچا دکھانا اور ان کی زبان بندی کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو استادِ شہ ہونا مہنگا پڑا۔ سرکاری پنشن تو کسی طرح ۱۸۶۰ء میں بحال ہو گئی لیکن گورنر جنرل بہادر کے دربار سے خلعت اور ملبر بحال نہ ہو سکا۔ اس بارے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> غالب اپنے دوستوں کو رابرٹ منٹگمری کی زبانی گفتگو کے حوالے سے جو اس "مژدہ جانفزا" کا حال لکھتے رہے ہیں وہ بے بنیاد تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوستوں سے اپنی سبکی چھپانے کے لئے ایسا لکھتے رہے۔ جس

خلعت کے لئے غالب اس قدر مشتاق تھے کہ اس کی پیروی وہ ایک گدائے مبرم کی طرح کرتے رہے، اس خلعت کے ملنے کی خبر پا کر وہ اپنا لے نہ جائیں یہ بات کچھ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مژدہ جانفزا غالب کے تخیل کا پروردہ تھا۔ ہمارے اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے بھی پہنچتی ہے کہ جب سر ڈانل میکلوڈ گورنر پنجاب نے اپنا دربار ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء میں کیا ہے تو اس موقع پر غالب کو نشست بہت ہی نچلی صف میں دی گئی تھی۔ اس ذلت اور خواری کو انہوں نے اپنے قصیدے میں بیان کیا ہے اور میکلوڈ صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس سبکی اور بے عزتی کا مداوا کریں۔ یہ قصیدہ دیوان غالب نسخہ عرشی میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

سب صورتیں بدل گئی ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام
اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشیب میں از روئے اہتمام
سمجھا اسے گر آپ ہوا پاش پاش دل
دربار میں مجھ پہ چلی چشمک عوام
عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لے لیا مجھ سے انتقام
امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال

بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہی اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

۔۔۔۱۸۶۶ء تک کی تو یہ روداد ہے۔اگر واقعتاً ان کو معمولی خلعت اور لمبر بڑے لارڈ صاحب کا واگزشت کیا گیا ہوتا تو پھر یہ بیکی میکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی طرف سے کیونکر معرض وجود میں آتی۔قرائن اور شواہد تو سارے یہی بتاتے ہیں کہ ان کا رتبہ پہلے سے بھی کم کر دیا اور گورنر جنرل یا وائسرے ہند کے دربار سے معمولی خلعت واگزاشت نہ ہوا۔(۷۵)

غالب اپنی بعض تصانیف کے انطباع کے وقت اخبارات میں منظوم اور نثری اشتہارات بھی دوسروں لوگوں کے نام سے بھیجا کرتے تھے۔ایک اشتہار جو "پنج آہنگ" کی طباعت کے حوالے سے ہے،اسعد الاخبار آگرہ میں ۱۲مارچ ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا۔

اشتہار کچھ یوں ہے:

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب،جو اپریل میں قیمت بھیج دے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروان راہ سخن
پایہ سنجان دستگاہ سخن
طے کرو راہ شوق زود از زود
آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر
دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی
چشم بینش ہو جس سے نورانی

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار
بارور جس کا سرو گل بے خار
اس سے انداز شوکت تحریر
اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
تھے ظہوری و عرفی و طالب
اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے
اسد اللہ خاں غالب ہے
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہو گا
سینہ گنجینۂ گہر ہو گا
میں جو ہوں در پئے حصول شرف
نام عالی کا ہے غلام نجف

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا ہے۔(۷۶)

مذکورہ بالا منظوم اشتہار ۱۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں صرف چیدہ چیدہ اشعار کو نقل کیا گیا ہے جو بندش الفاظ اور انداز بیاں سے غالب کے فن کی غمازی کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعرانہ تعلّی کسی شاعر کو ہی سوجھ سکتی ہے اور زیب دیتی ہے۔ غیر کے اندر کسی دوسرے کے لیے ایسا جذبہ پیدا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظوم اشتہار غالب کا زائیدہ طبع ہے۔ غالب نے اپنے خط بنام نواب علی بہادر مسند نشیں باندہ میں لکھا ہے کہ:

اگر پنج آہنگ میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لیے" قانون" کا حکم رکھتی ہے اور دقیق و نازک نکات، نادر ترکیبوں اور فصیح و شیریں الفاظ کا قیمتی ذخیرہ ہے۔(۷۷)

قاضی عبدالودود نے یہ اشتہار اپنی کتاب ''مآثر غالب'' میں درج کیا ہے اور تعلیقات میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> قرائن سے واضح ہے کہ یہ اشتہار خود غالب کا نظم کردہ ہے، اگرچہ غلام نجف خاں کی طرف سے ہے جو غالب کے شاگرد تھے۔(۷۸)

اودھ اخبار لکھنؤ کی اشاعت مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۶ء میں ''اشتہار طبع کلیات نظم جناب میرزا غالب دہلوی'' چھپا ہے۔ یہ اشتہار نہایت قافیہ دار نثر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ جملے مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ قریب بہ یقین ہے کہ یہ نثری اشتہار غالب کا زائیدہ طبع ہے کیونکہ اس تحریر میں غالب کے ذہنی و فکری رجحانات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اسی اخبار کی اشاعت ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء میں ایک تحریر بعنوان ''نواب میرزا اسداللہ خاں غالب'' چھپی ہے۔ جس میں غالب کی تعریف کی گئی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر بھی غالب کی ہی ہے کیونکہ اس میں جس طرح پنشن کا ذکر، انگریز حکام کی تعریف اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح کا ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے خود غالب نے لکھ بھیجا تھا۔ ''قاطع برہان'' کے مباحثے میں لکھنؤ کی ادبی فضا میں بھی ہل چل مچ گئی اور اس مباحثے میں ''زہرہ و مشتری'' نے بھی حصہ لیا جس کا ذکر درگاہ پرشاد نادر کے تذکرے ''تذکرہ النساء'' میں آیا ہے۔ غالب کی حمایت میں نور محمد خان عطارد نامی شخص نے ''اشرف الاخبار'' کو ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔ اس تحریر کا انداز بھی بعینہ غالب جیسا ہے۔ کیونکہ زہرہ و مشتری کا منہ عطارد ہی بند کر سکتا تھا اس لیے فرضی عطارد نامی شخص تخلیق کیا گیا جس طرح قتیل کی ''چہار شربت'' پر غالب کی ''پنج آہنگ'' عددی حیثیت سے غالب ہے۔ اس تحریر کے بارے میں نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

> میرا خیال ہے کہ مراسلہ نگار کا یہ نام 'نور محمد خاں عطارد' فرضی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ خط خود غالب نے لکھ کر بھیجا ہو یا اپنے کسی شاگرد سے بھجوایا

ہو۔(۷۹)

اسی طرح غالب نے اپنی تصنیف ''لطائف غیبی'' خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی بلکہ بقول شیخ محمد اکرام کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات، اخباروں میں چھپواتے تھے اور سیاح کو اس کی اطلاع، اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی۔ اصل میں غالب کے اس طرح کے اعمال میں ایک نفسیاتی گرہ پائی جاتی ہے اور وہ ہے ان کا حد سے بڑا ہوا پندار اور کبرِ نفس۔ مولانا عبدالمجید سالک ''لطائف غیبی'' کے بارے میں اسی حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مرزا غالب نے خود یہ رسالہ لکھا اور نام سیاح کا کر دیا۔ وجہ یہی کہ وہ خود منشی سعادت علی کے مقابلے پر آنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ لہٰذا ایک شاگرد کو آگے کر دیا اور محمد حسین دکنی کے حامی کو ایک دکنی سے ہی جواب دلوایا۔ (۸۰)

غالب ''لطائف غیبی'' کی اشاعت کے بعد سیاح کو لکھتے ہیں:

> یہ جو میں نے ''سیف الحق'' خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ چلتی رہے گی۔ ''لطائف غیبی'' نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔(۸۱)

''لطائف غیبی'' کی طباعت کے اخراجات خود غالب نے برداشت کیے۔ لیکن ان کا کبرِ نفس اس چیز کو گوارا نہ کرتا تھا کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔ جو بھی اس ضمن میں ان سے استفسار کرتا وہ یہی کہتے کہ مطبع والوں نے خود چھاپی ہے۔ ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:

> صاحب میں نے اپنے صرفِ زر سے ''لطائف غیبی'' کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپی ہیں۔(۸۲)

''سوالات عبدالکریم'' کے خاتمے کی عبارت بھی غالب کے اسی ''کبرِ نفس'' پر روشنی ڈالتی ہے۔

> نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب، امیر نامدار اور مع ہٰذا حلیم اور بردبار

> ہیں۔۔۔۔۔ میں نے ایک دن نواب صاحب محتشم الیہ سے پوچھا کہ آپ نے منشی سعادت علی صاحب کی بدزبانی کا جواب کیوں نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے تو کیا تم بسبیل تلافی سڑک پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے؟ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ پھر میں منشی کی خرافات کا جواب کیا دوں۔ اس امر کے اظہار سے میری غرض یہ ہے کہ حضرت غالب تمھارے مقابلے کو ننگ و عار سمجھ کر سکوت کر گئے۔۔۔۔ (۸۳)

غالب ''تیغ تیز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر میرے کبر نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے باجی پن پر کتل ہے، بہ مہر ذرہ تا آفتاب۔ لیکن پھر ''تیغ تیز'' کے انطباع کے بعد غالب نے امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا دیا اور جب آخر میں ناکامی کے آثار نظر آنے لگے تو مقدمہ واپس بھی لے لیا۔ کیونکہ ان کی انا مقدمہ میں ناکامی کو بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔

غالب ''محرق قاطع برہان'' کا خاکہ اڑانے چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش کہ یہ کام اپنے عزیزوں اور مداحوں سے انجام پائے۔ لہذا اس کام کے لئے غالب کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی مدد کی۔ اس بارے میں سید معین الرحمن لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ خود غالب ''محرق'' کی غلطیاں جمع کر رہے تھے، نیر رخشاں نے بھی یہ کام اپنے ذمے لیا تھا، علائی سے بھی انھوں نے مدد چاہی تھی، قدر بلگرامی کو بھی اس کے لیے ابھارنا چاہا تھا، سیاح نے بھی حسب توفیق اس کار خیر میں ہاتھ بٹایا اور حصہ لیا ہوگا۔ مختلف ارباب نظر، اپنے اپنے اندازے کے مطابق جو جو غلطیاں بروئے کار لائے غالب نے با ضابطہ مطالب دیگر، انہیں حلیہ عبارت سے آراستہ و پیراستہ کیا اور یوں ''لطائف غیبی'' عالم وجود میں آئی۔ (۸۴)

مذہب کے بارے میں بھی غالب کے ہاں متضاد بیانات ملتے ہیں۔ بعد میں اس مسئلے کو مولانا الطاف حسین حالی کے بیانات نے لاینحل بنادیا۔ ممکن ہے اگر حالی مرزا غالب کے مذہب کو نہ چھیڑتے تو یہ معاملہ اتنا طول نہ پکڑتا۔ لیکن حالی کے بعد محققینِ غالب تا حال اس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں اور غالب کے مذہب کو کھینچ تان کر اپنے اپنے مسلک کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں ہیں اور اب تک اس بارے میں متفقہ اور دوٹوک فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اصل میں غالب چونکہ وسیع المشرب تھے اس لیے ہر فرقہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ ان کے ہم مسلک ہیں۔ دوسرے غالب کے متضاد بیانات اس مسئلے کو مزید الجھا دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے مفاد کے پیش نظر مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف مذہبی رویہ رکھتے تھے۔ مثلاً غالب نے اہل تشیع دوستوں کے نام خطوط میں اثناعشری حیدری لکھا ہے اور مقصد صرف اور صرف ان کی ہمدردیاں سمیٹنا تھا۔ غالب نے میر غلام حسین قدر بلگرامی کے نام خط میں آخر میں لکھا ''اثناعشری حیدری''۔ اس بارے میں سید معین الرحمٰن ''لطائف غیبی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> اثناعشری حیدری'' کے اعلان کی غایت ''استحصال وانگیخت'' ہے، ورنہ اس سے پہلے یا اس کے بعد غالب نے قدر بلگرامی کے نام اپنے کسی خط میں، اپنے نام کے ساتھ ''اثناعشری حیدری'' کے ایزاد کی ضرورت نہیں سمجھی۔ (۸۵)

اسی طرح غالب حاتم علی میر کو لکھتے ہیں:

> صاحب بندہ اثناعشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو، ہم تو ایک آقا کے غلام ہیں۔ (۸۶)

دوسری طرف میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

> میاں لڑکے سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب

کی، وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔۔۔صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔ (۸۷)

اسی طرح میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ (۸۸)

حالی نے لکھا ہے کہ جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ ولغات تھی، اور نہ کوئی ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ یہاں حالی سے تسامح ہوا ہے کیونکہ غالب خود عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادرہوا۔

اس موضوع پر پروفیسر محمد باقر نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ برھان کے مطبوعہ نسخوں میں سب سے پہلا نسخہ وہ ہے جو لارڈ ھیسٹنگز (۱۸۲۳ء۔۱۸۱۳ء) کے عہد میں جولائی ۱۸۱۸ء میلادی میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔ اسے مشہور مستشرق کپتان ٹامس روبک نے سید کرم حسین الحسینی بلگرامی کے مقدمے کے ساتھ اور متعدد علما اور ۳۴ کتابوں سے مراجعہ اور برھان کے تیرہ خطی نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا اور تیسرا ۱۸۳۱ء میں حکیم عبدالمجید نے چھ اور علما کے تعاون سے شائع کیا اور غالب کے اپنے بیان کے مطابق قاطع برہان لکھتے وقت یہی نسخہ ان کے سامنے تھا۔ غالب نے متعدد مقامات پر اس نسخے کے صفحات کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب خانہ رضا رامپور سے برہان کا ایک مطبوعہ نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے جو ان کے بیان کے مطابق افضل المطابع کلکتہ میں

> ۱۲۵۱ھ، ۱۸۳۶ء میں بڑے سائز کے ۹۲۲ صفحات پر چھپا تھا اور جس پر غالب نے برہان کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ یہ نسخہ غالب نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو علاؤ الدین خان علائی کے تحفہ دے دیا تھا۔ چنانچہ یہ نوابان لوہارو کے کتاب خانے میں محفوظ رہا اور جب یہ کتاب خانہ رام پور منتقل ہوا تو یہ نسخہ بھی وہاں پہنچ گیا۔(۸۹)

پروفیسر محمد باقر لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ برحان کے ۱۸۳۴ء کے مطبوعہ نسخے کے علاوہ یہ دوسرا نسخہ تھا جو غالب کے زیرِ مطالعہ رہا۔ لیکن ایک آدھ مقام پر مجھے یہ شبہ بھی ہوا ہے کہ غالب کے پاس ان دونوں نسخوں کے علاوہ کوئی اور نسخہ بھی موجود تھا۔ کیونکہ اُس نے برہان میں شائع ہونے والی مہمل ترکیب "ماھوچی شمہ خضر" پر تنقید کی ہے وہ برحان کے ۱۸۳۴ء کے مطبوعہ نسخے میں صحیح طور پر یوں درج ہے "ماھی وچشمہ خضر": کنایہ از زبان و دھان معشوق است"۔

پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ:

> ظاہر ہے کہ غالب اگر اس کنایہ اور اس کے معانی کو صحیح طور پر چھپا ہوا دیکھتا تو اسے اعتراض کی ضرورت اور گنجائش نظر نہ آتی۔ میرے پاس برحان کے جو متعدد مطبوعہ نسخے ہیں، ان میں "ماھی وچشمہ خضر" صحیح طور پر درج ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب کے پاس برحان کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو ۱۲۷۳ قمری میں کلکتے سے شائع ہوا ہے۔ مہر صاحب کی کمک سے یہ راز کھلا کہ اس کے صفحہ ۲۵۴ پر
>
> "ماھی وچشمہ خضر"
>
> ماھوچی شمہ خضر
>
> اشتباہاً چھپا ہوا ہے اور غالب کا ایرادرست ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی تیسرا نسخہ بھی تھا جس میں یہ اسی طرح درج تھا۔(۹۰)

غالب کے مذکورہ بالا بیان کو قاطع برحان کے قضیہ کے پس منظر میں دیکھنے کی

ضرورت ہے۔ خط میں غالب نے بطور صفائی لکھا ہے کہ میرے پاس صرف چھاپے کی برحان قاطع موجود تھی تا کہ کسی طور اس شورشِ انگیز میں کمی واقع ہو۔

غالب کے مذکورہ بالا تمام بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی سیرت اور کردار مثالی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب اپنی انا کو تحفظ دینے کی غرض سے ایسا برتاؤ کرتے رہے ہیں اور ساتھ ہی ان کی مجبوریاں بھی تھیں۔ وہ مسائل کے حل کی سبیل میں تضاد بیانیوں سے بھی کام لیتے رہے۔ غالب کی دوہری اور بٹی ہوئی شخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے درست تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> غالب کی شخصیت میں کش مکش دراصل اسی سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ نظری اعتبار سے تو وہ ہستی اشیاء کو محض وہم سمجھتے ہیں لیکن عملاً انہی اشیاء کی طلب میں پریشان رہتے ہیں، چنانچہ وہ آپ کا بندہ اور پھروں ننگا، آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار جیسے قطعات کہنے، بہادر شاہ ظفر کو خوش کرنے اور انگریز وائسرائے وغیرہ تو ایک طرف ادنیٰ انگریز اہل کاروں تک کے قصیدے پڑھنے پر مجبور ہیں، شوپنہار نے شاید درست کہا تھا کہ ناسپاتی زندگی اس چھڑی سے مماثل ہے جسے ہاتھ پر متوازن رکھنے کے لیے اس کو مستقلاً گھمانا ضروری ہے۔ (۹۱)

اسی حوالے سے محمد موسیٰ کلیم لکھتے ہیں کہ:

> لوگ اس خوشامدانہ روش کو اس کے کردار کی کمزوری بتلاتے ہیں اور اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی کمزوری نہیں بلکہ اثبات ذات کا ایک منفی ہتھیار ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس ہتھیار کے استعمال سے غالب نے اپنی ادبی شخصیت کو زندہ سلامت رکھا۔ (۹۲)

غالب کی شخصیت کی اِس جہت کے بارے میں محمد رفیق خاور بھی اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دو باتیں خاص طور پر محسوس

> کرتے ہیں۔اس کی عام انسانی سرشت اور عالی ظرفی(High Mindedmen)بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔اور ان کا اجتماع بھی شاذ و نادر وقوع میں آتا ہے۔فلسفہ کے لیے ایک ایسے مزاج کی ضرورت ہے جو دنیا و مافیہا سے علیحدہ و منزہ رہ کر غور و فکر کرے اس کا ایک دیوتا کی آزادی اور وارفتگی سے مطالعہ کرے،ایک انسان کی حیثیت سے نہ دیکھے۔اس لیے لازماً ایک شخص جس کی طبیعت کا نمایاں عنصر فلسفیت یعنی اُمورِ عالیہ سے وابستگی ہے،عام انسانی طبائع اور افراد سے بہت مختلف ہوگا۔ایک ہی طبیعت میں عام انسانی فطرت یا دنیاوی اُمور میں دل چسپی اور تفکر بمشکل جمع ہوتے ہیں۔لیکن دنیا کی بزرگ ترین ہستیاں ان دونوں خصوصیتوں کی جامع ہیں۔شیکسپیر،گوئٹے اور رومی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔غالب کی طبیعت اس لحاظ سے شیکسپیر اور گوئٹے کی طبیعت کے ساتھ نہایت مشابہت رکھتی ہے۔۔۔۔غالب اس قدر زبردست فلسفی اور مفکر ہونے کے باوجود عام انسانیت کے کس قدر قریب ہے اور وہ دنیا کو ہیچ و بے بود سمجھتے ہوئے بھی اس کے مشغلوں اور کاموں میں عام اشخاص کی طرح دل چسپی لیتا ہے۔انھی کے سے جذبات اور خیالات کا مالک ہے اور انھی کی مانند آرزوئیں اور امیدیں رکھتا ہے۔بہ الفاظ دیگر وہ خارجی واقعات کی طرف بالکل عام انسانوں کی مانند ردِ عمل کرتا ہے۔۔۔۔۔جہاں وہ زندگی اور کائنات کے تمام پہلوؤں کا عمیق و وسیع مطالعہ کرتا ہے وہاں ایک عام فردِ بشر کے مخصوص رجحانات اور افکار سے بھی بیگانہ نہیں۔اس کے ضمیر کا ایک بالائی طبقہ ہے اور ایک زیریں،ایک ارفع و اعلیٰ اور دوسرا عام و ادنیٰ۔غالب کی طبیعت کی یہ دورنگی اس کے افعال،گفتار اور تحریرات سب میں جلوہ گر ہے۔(۹۳)

غالب خود بھی اپنی شخصیت کے اس پہلو سے آگاہ تھے۔جو کچھ انہوں نے کیا وہ یقیناً کسی نہ کسی مجبوری کے تحت تھا۔وہ خود کلیاتِ نظم فارسی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انصاف

بالائے طاعت یہ ہے کہ جو کچھ بالا خوانی اور خودستائی میں نے شعر کے ذریعہ کی ہے۔ اس کا نصف حصہ "شاہد بازاری" اور نصف حصہ "تونگری ستائی" سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس آزادی سے خوش ہوں کہ زیادہ تر اشعار عشق بازوں کے طور طریقے (بہنجار عشق بازاں) پر کہے گئے ہیں اور اس حرص و آز سے میرا سینہ داغ داغ ہے جس کے تحت میں نے دنیا طلبوں کی طرح چند اوراق اہل جاہ کی ستائش میں سیاہ کیے ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غالب کا ذوقِ تماشہ، لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۸۲-۸۳
۲۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، (جلد چہارم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۳۷
۳۔ اظہار الحق ملک، غالب کے خودنوشت حالات، مشمولہ "احوالِ غالب" (مرتب) ڈاکٹر مختار الدین احمد، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جون ۱۹۵۳ء، ص ۲۷
۴۔ قاضی عبدالودود، جہانِ غالب، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ص ۲۵۰
۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگِ غالب، نئی دہلی، غالب اکیڈمی، ۱۹۷۱ء، ص ۴۰
۶۔ کالی داس گپتا رضا، غالب درونِ خانہ، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۳
۷۔ ایضاً، حاشیہ، ص ۱۶
۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد چہارم) محولہ بالا ۲، ص ۱۵۳۷
۹۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگِ غالب، محولہ بالا ۵، ص ۴۷
۱۰۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد چہارم) محولہ بالا ۲، ص ۱۵۳۷
۱۱۔ کالی داس گپتا رضا، غالب درونِ خانہ، محولہ بالا ۶، ص ۱۲
۱۲۔ امتیاز علی عرشی، دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۸ء، دیباچہ ص ۳
۱۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۷۳
۱۴۔ امتیاز علی عرشی، دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) محولہ بالا ۱۲، ص ۱۳، ۱۴
۱۵۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش (مرتب) اردو میں اصولِ تحقیق (جلد دوم) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۷
۱۶۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، غالب، سید معین الدین قریشی (مترجم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۲ء، ص ۳۱

۱۷۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، ترتیب متن فارسی، سید اکبر علی ترمذی، کراچی: ادارہ یادگار غالب ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۶،۱۵۵

۱۸۔ مالک رام، ذکر غالب (کچھ نئے حالات) مطبوعہ، افکار، غالب نمبر، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء (شمارہ ۲۱۰۔۲۱۱) ص ۵۱

۱۹۔ ایضاً، حاشیہ، ص ۵۱

۲۰۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر، غالبیات اور ہم، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز ۱۹۹۴ء، ص ۶۷

۲۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء، ص ۴۸

۲۲۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، بحوالہ بالا ۱۷، ص ۶۴

۲۳۔ مالک رام، ذکر غالب، لاہور: مکتبہ شعروادب، سمن آباد، ۱۹۷۵ء، ص ۶۰۔۶۱

۲۴۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۵ء ص ۳۶

۲۵۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، بحوالہ بالا ۱۷، ص ۷۰

۲۶۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۷۔ مالک رام، ذکر غالب، بحوالہ بالا ۲۳، ص ۶۶

۲۸۔ قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں (حصہ ۲) پٹنہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۹

۲۹۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، بحوالہ بالا ۲۴، ص ۳۷

۳۰۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، غالب اور عصر غالب (غالب پر چند تحقیقی مقالات) کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۵ء، ص ۳۹۔۴۰

۳۱۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، بحوالہ بالا ۲۴، ص ۴۷

۳۲۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، بحوالہ بالا ۱۷، ص ۱۰۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۳۴۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، بحوالہ بالا ۲۴، ص ۱۷۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۳۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء، ص ۵۴۸
۳۹۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، غالبیات کے چند فراموش گوشے، "مرزا غالب کی تاریخ گوئی" (مضمون)، کراچی: ادارہ یادگار غالب ۲۰۰۲ء، ص ۱۸۰
۴۰۔ کسری منہاس، غالب کی تاریخ گوئی (مضمون) مشمولہ صحیفہ، غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء، ص ۸۳
۴۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) محولہ بالا ۱۳، ص ۱۱۰۵
۴۲۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸ ص ۴۵۷
۴۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) محولہ بالا ۱۳، ص ۱۱۱۳
۴۴۔ خلیق انجم (مرتب) غالب۔ کچھ مضامین، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۹۱ء، ص ۶
۴۵۔ ایضاً، ص ۶
۴۶۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، غالبیات کے چند فراموش گوشے محولہ بالا ۳۹، ص ۳۹
۴۷۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط (جلد دوم) محولہ بالا ۳۸، ص ۷۰۳
۴۸۔ ایضاً ص ۷۰۱
۴۹۔ مالک رام، غالب کے فارسی قصیدے (مضمون) نقوش، لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۴۳
۵۰۔ خلیق انجم، غالب اور شاہان تیموریہ، دہلی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۲ء، ص ۶۱
۵۱۔ سید قدرت نقوی، غالب کون ہے؟ ملتان: امروز پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰
۵۲۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب: پنج آہنگ، تدوین و تصحیح و تحقیق، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مطبوعات مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۶۷۳
۵۳۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ محولہ بالا ۲۳ ص ۱۶۸
۵۴۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی "مرزا غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ میں) مشمولہ (ارمغان ایران) مرتب، ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص ۷۰
۵۵۔ ایضاً ص۔ ۷۱
۵۶۔ مالک رام، غالب اور دربار رام پور، (مضمون) مشمولہ غالب نام آورم: سہ ماہی "اردو" کے مضامین کا انتخاب کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء ص ۳۷
۵۷۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب محولہ بالا ۲۱، ص ۷۰۔۷۱
۵۸۔ عبدالعزیز ساحر، "غالب گمان سے یقین تک" مشمولہ "بازیافت" جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء، شعبہ

اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، ص ۲۳۷، ۲۳۸

۵۹۔ کالی داس گپتا رضا، غالب کی بعض تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء، ص ۱۸، ۱۹

۶۰۔ پرتو روہیلہ (مرتب و مترجم) باغ دو در میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ، اسلام آباد: بزم علم و فن پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۶۳

۶۱۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یادو بود غالب، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۳ء، ص ۳۵

۶۲۔ انیس ناگی، غالب پریشان، لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۴۔۱۶۵

۶۳۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، تحور سعیدی (مترجم) کراچی: الکتاب، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۵۴۔۵۵

۶۴۔ قاضی عبدالودود، جہان غالب، بحوالہ بالا ۳، ص ۶۳

۶۵۔ ڈاکٹر۔ ظ۔ انصاری، غالب کی کہانی (مضمون) شاعر، بمبئی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۵۹۷

۶۶۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، تحور سعیدی (مترجم) بحوالہ بالا ۶۳، ص ۴۳

۶۷۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یادگار غالب، بحوالہ بالا ۶۱، ص ۱۳۹

۶۸۔ انیس ناگی، غالب پریشان، بحوالہ بالا ۶۲، ص ۱۶۵

۶۹۔ اسداللہ خاں غالب، دستنبو، تحور سعیدی (مترجم) بحوالہ بالا ۶۳، ص ۸۹۔۹۰

۷۰۔ مالک رام، ذکر غالب، بحوالہ بالا ۴۳ حاشیہ، ص ۱۰۳

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۷۲۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد اول) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳۰

۷۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) بحوالہ بالا ۳۸، ص ۶۲۷

۷۴۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، نوادر غالب، ''غالب اور اودھ اخبار'' (مضمون) کراچی: ادارہ یادگار غالب ۲۰۰۲ء، ص ۳۰

۷۵۔ ممتاز حسین، غالب۔ ایک مطالعہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت اول ۱۹۶۹ء، ص ۷۴۔۷۶

۷۶۔ اکبر علی خاں، ''غالب اپنے معاصر اخبارات میں'' (مضمون) نقوش غالب ۱۹۶۹ء، ص ۶۳۲

۷۷۔ محمد عمر مہاجر، پنج آہنگ (آہنگ پنجم) غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۵

۷۸۔ میرزا اسداللہ خاں غالب: پنج آہنگ۔ تدوین و تصحیح و تحقیق۔ سید وزیر الحسن عابدی بحوالہ بالا ۵۲، ص ۱۰۷

۷۹۔ نثار احمد فاروقی، تلاش غالب، لاہور: کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص۸۲
۸۰۔ سید معین الرحمن (مرتب) لطائف غیبی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 1995ء، ص۸۲
۸۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) بحوالہ بالا ۳۸، ص ۵۷۰
۸۲۔ ایضاً، ص۵۶۲
۸۳۔ سید معین الرحمن (مرتب) لطائف غیبی بحوالہ بالا ۸۰، ص ۴۳
۸۴۔ ایضاً، ص۲۱
۸۵۔ ایضاً، حاشیہ ص۱۸۔۱۹
۸۶۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) بحوالہ بالا ۳۸، ص ۷۰۶، ۷۰۷
۸۷۔ ایضاً، ص۴۹۹
۸۸۔ ایضاً، ص۷۶۳
۸۹۔ نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب، درفش کاویانی، باہتمام پروفیسر محمد باقر، لاہور: مطبوعات مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص۲۵
۹۰۔ ایضاً، ص۲۶
۹۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، غالب۔ فکر و فرہنگ، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص۱۸
۹۲۔ محمد موسیٰ کلیم، مقام غالب، لاہور: جدید ناشرین، اردو بازار، ۱۹۶۵ء، ص۸۱
۹۳۔ محمد رفیق خاور، غالب کی ذہنیت، مشمولہ، ماہ نو (خصوصی اشاعت) غالب کے دوسو سالہ جشن ولادت کے موقع پر۔ شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۵۱، مارچ ۱۹۹۸ء

شمس الرحمٰن فاروقی۔ غالب یا میر پرست

شمس الرحمٰن فاروقی ۔ غالب یا میر پرست

کسی بھی فن کے تخلیق کار کا کسی دوسرے تخلیق کار کے ساتھ تقابل اور موازنہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں اس کی نمایاں مثال مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے۔ بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی کی میرؔ اور غالبؔ پر گرفت خاصی مضبوط ہے اور اس ضمن میں اُن کا خاصا معیاری تحقیقی اور تنقیدی کام بھی سامنے آ چکا ہے۔ فاروقی صاحب کی تصنیف "شعر شور انگیز" جلد اول پہلی بار ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب نے اُردو ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے راقم کی بھرپور راہنمائی کی اور مصنف کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا اور آج اُس سے بڑھ کر ہے۔ میری غالب سے دل لگی اور دل چسپی کا آغاز توسنِ شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا کیوں کہ وہ فطرتِ انسانی کا نباض تھا۔ اِسی دل چسپی کی بنا پر بعد میں "غالبؔ پر سوانحی ادب" پر ڈاکٹریٹ بھی کی۔

کچھ عرصہ پہلے لمز کا مجلہ دراساتِ اُردو "بنیاد" کا شمارہ ۲، ۲۰۱۲ء دستیاب ہوا جس میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بعنوان "میر کی شعری روایت" ملاحظہ کیا۔ یہ ستمبر ۲۰۱۰ء میں دیے ہوئے ایک لیکچر کا متن ہے جو انہوں نے بھارت کی غالب اکیڈمی میں میر پر ایک سیمینار میں دیا تھا۔ دورانِ مطالعہ فوراً ذہن میں "شعر شور انگیز" جلد اول کے ابتدائی مضامین "خدائے سخن، میر کہ غالب؟" اور "غالب کی میری" کی بازگشت سنائی دی۔ "شعر شور انگیز" فاروقی صاحب کا میر پر انتہائی وقیع تحقیقی اور تنقیدی کام ہے۔ اس کے لیے وہ داد و تحسین کے سزاوار ہیں۔ اس کام میں اُن کی جگر کاوی صاف نظر آتی ہے۔ اس حوالے

سے انہوں نے لکھا ہے کہ میری تحریر میں نغمۂ داؤدی تو شاید نہ ہو، لیکن میر کی عظمت کو الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش ضرور ہے۔ اس کوشش میں آپ کو دماغ کے تیل کے ساتھ ساتھ خونِ جگر کی بھی کارفرمائی شاید نظر آئے۔' بلاشبہ خونِ جگر کی آمیزش سے نقشِ میر تمام ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں میر سے مبالغانہ حد تک عقیدت اور طرف داری کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ فاروقی صاحب کو غالب سے بھی شدید لگاؤ اور دل چسپی ہے۔ جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ اپنے مضمون ''غبارِ کارواں'' میں بی۔ اے کے امتحان سے فراغت کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن دنوں سے لے کر آج تک شیکسپیئر اور میرے درمیان ایک ایسا ربط قائم ہے۔ جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا اور جو غالب کے علاوہ کسی اور شاعر کے ساتھ قائم نہیں ہو سکا۔۔۔۔۔۔۔ غالب کو بھی میں نے ۱۹۵۳ میں سنجیدگی سے پڑھا۔ ان کے اسرار مجھ پر ذرا دیر میں کھلے لیکن بالآخر میری نظر میں غالب اور شیکسپیئر کے علاوہ بہت کم رہا[۲] اس کے علاوہ غالب پر ان کی مستقل تحریریں بھی ہیں جن میں ''تفہیم غالب''، ''غالب کے چند پہلو'' اور ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں شامل مضامین ''غالب اور جدید ذہن''، ''اردو شاعری پر غالب کا اثر''، ''غالب کی مشکل پسندی'' اور ''غالب کی ایک غزل کا تجزیہ'' شامل ہیں۔

اس مضمون میں فاروقی صاحب کے مذکورہ بالا تینوں مضامین کو مدنظر رکھ کر کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔ ایک بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ میر اور غالب کے زمانے میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب کو یہ شکوہ ہے کہ جو پذیرائی آج کے دور میں غالب کے مقدر میں آ رہی ہے، اس سے میر محروم کیوں ہیں۔ مضمون ''میر کی شعری روایت'' کی ابتدا ہی اسی حوالے سے کرتے ہیں کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میر کا ذکر اب کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ ستمبر ۲۰۱۰ء میں میر کی وفات کو دو سو برس ہو گئے۔ اس مناسبت سے کہیں کہیں میر پر جلسے اور کہیں کہیں سیمینار ہوئے۔ لیکن اس ہماہمی اور گونج اور ذوق

وشوق کے اظہار کا ایک شمہ بھی نظر نہ آیا جو غالب کی سوسالہ برسی پر کئی ملکوں میں دور دور تک پھیل گیا تھا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا مرتبہ میر سے بالاتر ہے۔ یعنی میر کے مقابلے میں غالب عظیم تر شاعر ہیں، یا یہ کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں لہٰذا غالب کے تئیں ہمارے دل میں جو عزت ہے اور محبت ہے وہ میر کے لیے نہیں ہوسکتی۔ مطلق طور پر یہ جواب درست ہو یا نہ ہو لیکن منطقی اعتبار سے یہ جواب اس لیے غلط ہے کہ ہم صرف اپنے لیے یا صرف اپنی طرف سے، جواب دے سکتے ہیں۔ ہم تمام تاریخ کی طرف سے حکم نہیں لگا سکتے کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ کل کیا فیصلہ ہوگا اور کل کا تنقیدی مذاق اور کل کے قاری کا شعور کسی شاعر کے بارے میں کیا کہے گا، یہ ہم نہیں جانتے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی طرف سے ہی حکم جاری ہوتا ہے۔ کیوں کہ فن کے عناصر خود تاریخ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کوئی حکم صادر کرے۔ کالی داس، حافظ، سعدی، شیکسپیئر اور گوئٹے کے بارے میں تاریخ نے ترمیم کیوں نہ کی اور ان کے بارے میں تنقیدی مذاق اور قاری کے شعور میں آج تک تبدیلی کیوں نہ آئی۔ ظاہر ہے کہ ان کا فن شعور کی بلندی اور پختگی لیے ہوئے ہے، اس لیے تاریخ نے جو فیصلہ ان کے بارے میں صادر کردیا ہے اُس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ مزید ایک نکتہ یہ بھی اٹھاتے ہیں کہ جب غالب آگئے تو میر کا درجہ غالب کے سامنے پست ہوگیا۔ آب آمد، تیمم برخاست۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ کل کلاں کوئی اور شاعر پیدا ہوسکتا ہے جو غالب کو تخت سے اتار کر ان کی جگہ لے لے۔[۴]

ہر فن کار کی اپنی اہمیت اور جگہ ہوتی ہے، خواہ کم خواہ زیادہ۔ میر کی اپنی جگہ ہے اس کو اُن سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اسی طرح غالب کی اپنی جگہ ہے اسے کوئی دوسرا نہیں چھین سکتا۔ اردو میں ایک روشن مثال غالب اور اقبال کی ہے۔ اقبال قوم کی روح میں زندہ رہنے والا gaint poet ہے۔ تو کیا اس نے غالب کو اُس کے تخت سے اتار کر اُس کی جگہ لے

لی؟ ہرگز نہیں غالب آج بھی اپنی جگہ قائم ودائم کھڑا ہے اور اقبال اپنی جگہ۔ دونوں کا تقابل اور موازنہ سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔

ایک اعتراض یہ کہ ایک فیشن ایبل رائے رہی ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں وہ قدر نہ ہوسکی جو بعد میں ہوئی۔ مصطفیٰ خان شیفتہ پر غالب کو اتنا اعتماد تھا کہ جب تک شیفتہ کی پسندیدگی نہ حاصل کر لیتے، اپنی (فارسی) غزل دیوان میں درج نہ کرتے۔

ان کا بہت مشہور شعر ہے۔

غالب بہ فن گفتگو ناز دبدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

لیکن خود شیفتہ نے مومن کی شاگردی اختیار کی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا اور غالب کا ۱۸۶۹ء میں، لیکن مومن کے بعد بھی شیفتہ نے غالب کی شاگردی نہ اختیار کی۔[۵] دوسری طرف میر کے حوالے سے شیفتہ ان کے ہاں نامعتبر ٹھہرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "اس قسم کی غلط فہمی پر کہ شیفتہ نے میر کے بارے میں لکھا تھا کہ "پستش بغایت پست وبلندش بسیار بلند"۔ اول تو شیفتہ کون سے عرش سے ٹوٹے ہوئے تارے تھے کہ ان کی رائے بے کھٹکے تسلیم کر لی جائے۔۔۔[۶]

اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ غالب کی اپنے زمانے میں وہ قدر افزائی نہ ہوئی جس کے وہ حق دار تھے اور اس کی وجہ تھی کہ غالب کا ذہن اپنے زمانے کی رفتار سے بہت آگے تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالب دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا اور اس بات کی اسے سزا بھی ملی۔ اس کی شاعری کو مہمل، اس کے انداز فکر کو نامانوس اور اس کے اسلوب حیات کو قابل اعتراض قرار دیا گیا۔[۷] دوسرے یہ کہ غالب کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ شیفتہ کے استحسان کے بغیر کوئی غزل اپنے دیوان میں شامل نہ کرتے۔ اول یہ

کہ غالب اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی داں سمجھتے تھے اور فارسی میں امیر خسرو کے سوا ان کی نظر میں اور کوئی جچتا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ، غالب کے مربی تھے اور غالب کی فطرت میں تھا کہ وہ جہاں یافت کا امکاں ہوتا وہاں اپنی توانائیاں صرف کر دیتے۔ جب غالب کو ۱۸۴۷ء میں قید کی سزا ملی تو اس دورانیہ میں شیفتہ نے اُن کا خوب خیال رکھا اور اس کے صلے میں غالب نے اُن کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا۔ اور یہ شعر اسی قصیدے کا ہے۔

میر کے بارے میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کا کلام اب ہمارے لیے فوری اور بامعنی نہیں رہا۔ سو پچاس شعر ضرور میر کے یہاں ایسے ہوں گے جو ہمارے ذہن کو غالب کے شعروں کی طرح متاثر کریں، لیکن عمومی طور پر میر کا نہ تو کلام ہی اس قدر اعلیٰ درجے کا ہے اور نہ اسے ہمارے ذہن سے کوئی قربت ہے۔ مندرجہ بالا بیان کا یہ حصہ بالکل درست ہے کہ غالب اور جدید ذہن میں بڑی ہم آہنگی ہے، لہٰذا جدید ذہن میر کے مقابلے میں غالب کو فوقیت دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے غالب صدی اتنے بڑے پیمانے پر منائی۔ لیکن یہ بیان ہمیں میر یا غالب کے بارے میں کسی آفاقی سچائی سے روشناس نہیں کرتا۔ یہ بیان صرف ہمارا فیصلہ ہے، تاریخ کا نہیں۔ ہم تاریخ کی طرف سے فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ صرف اپنی طرف سے فیصلہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کل کا جدید ذہن خود کو غالب سے بالکل خارج از آہنگ پائے۔ یا کل کا قاری غالب کو قبول کرنے سے انکار کر دے، خواہ یہ کسی غلط فہمی ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو۔[8]

حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان صرف ہمارا فیصلہ نہیں بلکہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ اگر آج جدید ذہن اپنے آپ کو غالب سے ہم آہنگ پاتا ہے تو یقیناً مستقبل کا ذہن اس سے بھی بڑھ کر ہم آہنگ پائے گا۔ دوسرے یہ ممکن ہی نہیں کہ کل کا قاری غالب کو رد کر دے۔ اس لیے کہ غالب نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی کے سب تیور بیان کر دیے ہیں۔ ممکن نہیں

کہ ایک باشعور اور طبع سلیم قاری خود کو غالب سے خارج از آہنگ پائے۔ فاروقی صاحب حالی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کا المیہ، بلکہ ہمارا المیہ یہ تھا کہ ہم نے غالب کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ ایک بالکل خالی بیابان میں تنہا شجر ہیں۔ ان کے پہلے کوئی اور شجر کیا، گھاس بھی نہیں تھی۔ ہم نے سائنس میں یہ بات تو قبول کر لی اور ہمیشہ کے لیے مان لی کہ گھاس نہ ہوتی تو پیڑ بھی نہ ہوتا۔ لیکن ہم نے حالی کی یہ بات بھی فوراً مان لی کہ غالب کا ذاتی اور شعری مزاج یہ تھا کہ وہ شارع عام پر چلنے سے بچتے اور کتراتے تھے۔ جس طرز کا شعر پہلے کہا جا چکا تھا، حالی کے بقول غالب اس طرز کا شعر ہرگز نہ کہتے تھے۔ چنانچہ غالب ہماری تہذیب کا ایسا درخت ہیں جن کے پیچھے کوئی میدان نہ تھا۔ وہ درخت اپنا جواز اور اپنا وجود آپ تھا۔[9]

غالب نے کبھی بھی شعری روایت سے انحراف نہیں کیا۔ حالی کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ غالب نے اپنے آپ کو محض روایت تک محدود نہیں رکھا بلکہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدت بھی پیدا کی۔ گویا انہوں نے روایت کو جامد نہیں ہونے دیا بلکہ اس میں تازہ خون کی آمیزش بھی کی ہے۔ اس ضمن میں دیکھیں تو خود فاروقی صاحب کو ''شعر شور انگیز'' میں قدم قدم پر غالب کی یاد آتی ہے۔ اور یہ غالب کی جدت کی بنا پر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں جہاں مضمون کی یکسانیت ہے لیکن اس کی ادائگی میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ میر کا شعر:

فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا
پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

میر کے برخلاف درد اور غالب نے اس محاورے کو صرف ''مجبوری'' کے معنوں میں ستعال کیا ہے، لیکن غالب کے یہاں محاورہ، استعارہ اور پیکر اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ ن کا شعر دونوں سے بڑھ گیا ہے۔

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل
سنگ گراں ہوا ہے یہ خوابِ گراں مجھے (درد)
مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے (غالب)[10]
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روز وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

غالب اس مضمون کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں"

پھر میر کی غزل نمبر ۱۵ کا تیسرا شعر:

دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا

لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شعر زیر بحث کو پڑھ کر غالب کا مشہور زمانہ شعر ذہن میں آنا فطری ہے:

چمن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب کے شعر میں جو نفسیاتی ژرف بینی، طنز اور ہمدردی کا امتزاج اور کنائے کی باریکی ہے، میر کے شعر میں اس کی تلاش بے سود ہوگی۔[11]

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا

''طیر'' اور ''پر'' کی مناسبت دل چسپ ہے۔ اسلوب اور مضمون دونوں لحاظ سے یہ غالب کے مندرجہ ذیل شعر پر اثر انداز ہوا ہے:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس حوالے سے فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کے شعر میں عمومی کیفیت ہے، جو اپنا رنگ آپ رکھتی ہے۔ یعنی گرفتاری کسی مخصوص بدنصیب کی تقدیر نہیں، کسی کا بھی مقدر بن سکتی ہے۔[۱۳]

غزل نمبر ۲۲ کا تیسرا شعر:

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

اس شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب نے اس مضمون کو بہت بہتر انداز میں کہا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کا انداز پراسرار اور متفکرانہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں ایک نازک تمثیل بیان ہوئی ہے۔ میر کا شعر ان صفات سے خالی ہے۔[۱۴]

غزل نمبر ۳۳ کا چوتھا شعر:

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو غالب نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں ادا کیا ہے:

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

حق یہ ہے کہ غالب کے شعر کی سج دھج کے مقابلے میں میر کا شعر پھیکا ہے۔[۱۵]

روایت کے تسلسل پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ناقدین نے غالب کو اردو

شاعری کی روایت سے الگ کر کے غلط کیا ہے اور یہ بات غالب کی شان میں بڑے فخر سے کہی گئی کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ اسی حوالے سے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ میر سے ناسخ اور پھر غالب تک کسی قسم کا تسلسل دریافت کرتے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے یہاں سیاسی انقطاع اس قدر زبردست اور اس قدر موثر طور پر واقع ہوا کہ میر کے بعد جو کچھ ہوا ہم نے اسے بھلا کر غالب پر تجاہل کیا۔[۱۶]

اصل میں غالب کے حوالے سے حقیقت ہی یہی ہے کہ اب معاشرے کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور تھا اور غالب وہ پہلا شخص تھا جس نے نہ صرف آنے والے دور کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا بلکہ اس نئے زمانے کے لیے ایسا فن بھی تخلیق کیا جو زمانے کی نبض پر ہاتھ بھی رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ پذیرائی نہ مل سکی جو بعد میں ملی اور یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر ایک طرف میر کی شاعری اتنی قابل اعتنا نہ رہی جتنی پہلے تھی۔ کیوں کہ زمانے کا مذاق اور مزاج بدل چکا تھا اور غالب کی شاعری اس مذاق اور مزاج کی عکاسی کر رہی تھی جس کو معاشرے کو ضرورت تھی، ہے اور رہے گی۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ میر نے شعر کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کیا ہے جسے "کیفیت" کہتے ہیں:

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی

اور ان کے نزدیک کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شعر میں بظاہر کوئی معنوی پیچیدگی یا گہرائی نہ ہو اور پھر بھی وہ فوراً سامع کے اوپر جذباتی ردعمل پیدا کرے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "غالب نے "کیفیت" کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ اس اصطلاح کے بھی معنی اب گم ہو گئے ہیں، لیکن در حقیقت کیفیت اس چیز کا نام ہے جس کو ذہن میں رکھ کر بیدل نے اپنا مشہور فقرہ کہا ہو گا کہ "شعر خوب معنی نہ دارد" ۔۔۔ بعض اوقات ایسے شعر کے معنی الفاظ میں بیان بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر اس کا جذباتی تاثر یا محاکاتی اثر دیرپا نہ ہو، یا بعض مخصوص سیاق و سباق کا محتاج ہو، تو اس شعر میں کیفیت نہیں، بلکہ سنگینیت ہو گی۔ میر نے اس نظریے کو اس

طرح بھی بیان کیا ہے ؎

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

"کہیو پھر" میں شعر کو صرف دہرانے کی درخواست نہیں ہے، بلکہ نکتہ یہ بھی ہے کہ ایسا شعر اور بھی کہو۔ غالب کے یہاں کیفیت کے شعر خال خال ہیں، لیکن میر کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ کیفیت کے علاوہ شعر میر کی تمام تر خصوصیات غالب کے یہاں غالب کی اپنی تخلیقی شان کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔ ان کی شعریات کے کئی پہلوؤں میں مماثلت ان کے ذہنی اشتراک پر دال ہے۔[17]

میر کے مذکورہ شعر میں شاعرانہ تعلّی واضح نظر آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس کو بیدل نے "شعر خوب معنی نہ دارد" کہا ہے اور میر کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں۔ ترقی یافتہ شعری ذوق اور تنقیدی شعور یہ سوال کرے گا کہ یہ کس قسم کی کیفیت ہے اور کس درجے کی ہے۔

جیسا کہ حسن عسکری نے کہا ہے کہ "جس ادب کی تخلیق میں دماغ استعمال نہ ہو، برساتی کھمبیوں کی طرح ہے۔ جس سے زمین تو ڈھک جاتی ہے مگر غذا حاصل نہیں ہو سکتی۔"[18] یہ درست ہے کہ غالب تاریخ میں رہتے ہوئے بھی اس کی تابع داری نہیں کرتے اور بقول ڈاکٹر آفتاب احمد خاں غالب ہم سے ایک ہم عصر کی طرح مکالمہ کرتے ہیں۔[19] جب کہ میر اس صفت سے محروم نظر آتے ہیں۔ میر اور غالب کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے حسن عسکری لکھتے ہیں کہ میرؔ عام زندگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہیں، غالبؔ اسے اپنے اندر سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی غالب روحانی بلندی کا صرف ایک ہی تصور کر سکتے ہیں کہ تعینات کو نیچے چھوڑ کر اوپر اٹھیں۔ میرؔ انہی تعینات میں رہ کر اور ان تعینات کی تہہ میں جا کر وہ روحانی درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔[20]

روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعد میں جب روایت کے بارے میں کچھ بات ہونی لگی تو کہا گیا کہ روایت کے ''صالح'' عناصر کو اختیار یا قبول کر سکتے ہیں۔ گویا روایت کوئی مردہ جسم ہے جس میں سے وہ اعضا جو صحت مند ہیں انھیں نکال کر دوسرے اپنے کام میں لا سکتے ہیں، لیکن جو اعضا کہ فاسد ہیں، انھیں سختی سے مسترد کر دینا چاہیے۔''[۲۱]

یہاں جو روایت کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ ایک جامد تصور ہے۔ اس تصور پر عمل پیرا ہونے سے روایت کے اپنی موت آپ مرنے کے وسیع امکانات ہیں۔ اس سے ادب میں بھی کہنگی اور فرسودگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں جدت اور تازگی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر قسم کی روایت کو گلے لگایا جائے اور تخلیق کار جو کہ اولیں نقاد بھی ہوتا ہے، اس امر کو مدنظر رکھتا ہے کہ اسے کہاں کہاں تک روایت پر عمل پیرا ہونا ہے اور کہاں کہاں اس سے الگ رہ کر تخلیقی سفر جاری رکھنا ہے۔ دوسرے یہ کہ انفرادیت کی پاس داری کو اس طرح قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ادبی انفرادیت بھی حقیقت میں کچھ عرصہ بعد روایت ہی کا روپ دھار لیتی ہے لیکن محض روایت کی پابندی تو تخلیق کار کو پابند سلاسل کر دیتی ہے اور اس کے اوریجنل کام کو بھی سامنے نہیں آنے دیتی۔ ادب عالیہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آفاقیت انہی کے مقدر میں آئی جنہوں نے خود اپنا راستہ نکالا اور جنہوں نے دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے چبانے پر اکتفا کی وہ خود بھی راہ میں گم ہو گئے۔ یہی چیز غالب کو بھی زندہ اور تر و تازہ رکھے ہوئے ہے۔ اس کا اندازہ خود فاروقی صاحب کو بھی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون ''غالب اور جدید ذہن'' میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ترقی پسند نظریہ اور حالی میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں روایتی شاعری سے نالاں تھے اور انسان کو شاعری میں اس کا اصل مقام دلانے پر مصر۔ یہاں بھی غالب ان کے کام آئے کیوں کہ غالب کا تفکر اور حقائق تک پہنچنے کا میلان روایتی شاعری کی نفی کرتا تھا اور ان کا خوددار، خود بیں، باوقار انسان وہ پس ماندہ اور قدموں تلے کچلا ہوا شخص نہیں تھا جس کی تصویر ترقی پسند نقادوں

کو عام اردو شاعری میں دکھائی دیتی تھی۔ ترقی پسند نقادوں کو غالب میں احتجاج اور بغاوت کے عناصر نظر آئے۔[۲۲]

غزل کی روایت پر بات کرتے ہوئے اختر انصاری لکھتے ہیں کہ اُردو کی روایتی غزل اپنے تمام کلاسیکی آن بان کے ساتھ غالب کی شاعری کے روپ میں اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور اس کے بعد روایتی خطوط پر اُس کے مزید ارتقا کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ غالب کی غزل نے حدِ سکندری بن کر آگے بڑھنے کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے اور غالبؔ کی نابغیت اور عبقریت کو شاید اس سے بڑھ کر خراجِ تحسین پیش کیا بھی نہیں جا سکتا۔ کہ اس نے اردو کی کلاسیکی غزل کا خاتمہ کر دیا۔ یعنی کم وبیش دو سو سال تک جن خطوط پر اردو غزل کا ارتقا ہوا تھا انھیں خطوط پر قائم رہتے ہوئے اور انھیں بنیادوں پر اپنے فکر وفن کی عمارت کو استوار کرتے ہوئے غالب نے بلندی کے اس نقطے کو چھو لیا جس سے بلند تر مقام کا تصور بظاہر اور عملاً ناممکن ہو گیا۔[۲۳] حالانکہ خود ہی غالب کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ بندرت طلب طبیعت اپنی عمارت انھی چیزوں پر استوار کرتی ہے جو پہلے سے موجود ہوں، لیکن اس کی عمارت اپنی تفصیلات و جزئیات میں پہلے سے موجود بنیادوں سے مختلف بنتی ہے۔ غالب کا یہی عالم تھا۔[۲۴]

روایت کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ چلئے اردو کی روایت سے ولی بھی خارج ہوئے کیوں کہ میر انھیں کچھ نہ سمجھتے تھے۔[۲۵] میر کا اثر کیوں اور کس طرح پھیلا اور میر کے لائے ہوئے انقلاب کی نوعیت کیا تھی، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں ولی کے بارے میں جاننا چاہیے۔ ولی نہ ہوتے تو میر کا ہونا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ میں اسے سرے سے ناممکن نہیں کہتا کیوں کہ میر نے خود ہی ریختہ، یعنی اردو کی شاعری کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ فارسی والوں کی طرز میں شاہجہاں آباد کی زبان میں ہے۔ مگر یہ بات تو یقینی ہے کہ میر کے انقلاب کے لیے ولی نے راہ ہموار کی تھی۔ ولی اور میر

میں وہی رشتہ ہے جو ناسخ اور غالب میں ہے۔[۲۶]

مذکورہ اقتباس میں کچھ جملے معترضہ بھی ہیں۔ مثلاً میر ولی کو کچھ نہ سمجھتے تھے تو پھر غالب کے بارے میں اتنا پریشاں کیوں ہیں۔ دوسرے ولی نہ ہوتے تو میر کا ہونا مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن ہرگز نہ تھا۔ مزید آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ ولی کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن پر میر کا گمان گزر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ولی کا انداز میر کے یہاں بہت ترقی کر کے آیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ولی بہت بڑے شاعر تھے، لیکن میر سے بڑے شاعر نہ تھے۔[۲۷]

شاید بقول فاروقی صاحب، پروفیسر محمد حسن صاحب نے درست ہی کہا تھا کہ جو شخص میر اور غالب کی شعریات کو ایک ہی مانے، اسے میر کے بارے میں کچھ معلوم ہے نہ غالب کے بارے میں[۲۸] اور پھر خود ہی لکھا ہے کہ غالب نے میر کی زبان اور اسلوب کو کبھی اختیار نہ کیا۔ جس طرح کی ''اشرافیہ'' اور ''ادبی'' زبان کے وہ خالق تھے، وہ میر کی سی زبان کو قبول ہی نہ کر سکتی تھی[۲۹] ایک جگہ پھر اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب اور میر کا موازنہ کرنا، یا ان کا بیک وقت مطالعہ اس غرض سے کرنا کہ ایک کے ذریعے دوسرے پر روشنی پڑے، غلط کار گزاری نہیں، بلکہ دراصل دونوں کی تعین قدر کی پہلی منزل ہے۔ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ غالب اور میر الگ الگ طرح کے شاعر ہیں۔ میں نے اس بات سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ دونوں کے اسلوب مختلف ضرور ہیں، لیکن دونوں ایک ہی طرح کے شاعر ہیں، اس معنی میں کہ دونوں کی شعریات ایک ہیں۔[۳۰]

لیکن اسی اصول کی نفی وہ اپنے مضمون ''اردو شاعری پر غالب کا اثر'' میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> بڑا شاعر اپنا کوئی اسکول قائم نہیں کرتا، یہ بات عجیب ضرور ہے لیکن اتنی عجیب نہیں جتنی یہ حقیقت کہ بڑے شاعر کی آنکھ بند ہوتے ہی جو شعری اسلوب نمودار ہوتا ہے وہ اس کے اسلوب کی تقریباً ضد ہوتا

ہے، اور اگر ضد نہیں ہوتا تو اس سے قطعاً مختلف ضرور ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی صرف اردو پر صادق نہیں آتی۔ یونان کے تینوں بڑے ڈرامہ نگار ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہیں، بلکہ اکثر متغائر بھی ہیں۔[۳۱]

ایک بات تو یہ کہ شعریات کی اصطلاح ہی مبہم ہے اور بادی النظر شعریات اور روایت ہم معنی ہیں۔ گویا ایک زبان اور ایک معاشرے میں رہنے والے شعرا کی شعریات تو ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے کس طرح ممتاز کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ادب میں کوئی سائنسی فارمولہ تو استعمال کیا نہیں جاسکتا۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جاوید رحمانی لکھتے ہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غالبؔ اور میرؔ کی شعریات ایک طرح کی ہے۔ یہ دلیل طلب ہے یا پھر شعریات سے فاروقی کی مراد کیا ہے؟ اس کی وضاحت ضروری تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے فوراً بعد فاروقی لکھتے ہیں کہ غالب کا تخیل آسمانی اور باریک تھا، میر کا تخیل زمینی اور بے لگام۔ غالبؔ نے اپنی شاعری کے لیے اس طرح کی زبان وضع کی جسے ادبی زبان کہا جاسکتا ہے۔ میرؔ نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنایا۔

یہاں پر یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ جب تخیل مختلف، دائرہ کار مختلف اور زبان مختلف تو شعریات ایک طرح کی کیسے ہوئی؟ کیا صرف اس لیے کہ دونوں کا ذریعۂ اظہار اردو ہے؟ یہ شعریات کے مفہوم کو ضرورت سے زیادہ وسعت دے دینا ہوگا۔[۳۲]

اسی حوالے سے اپنے مضمون "غالب کی میری" میں لکھتے ہیں کہ غالب نے میر سے بار بار استفادہ کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غالب اور میر ایک ہی طرح کے شاعر تھے، یعنی بعض مظاہر کائنات اور زندگی کے بعض تجربات کو شعر میں ظاہر کرنے کے لیے دونوں ایک ہی طرح کے وسائل استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کا اسلوب میر سے مستعار ہے، اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ زندگی کے کسی موقعے

یا منزل پر غالب نے طرز میر کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں شاعروں کی ذہنی ساخت اور طرز فکر میں مماثلت تھی [۳۳] اب اس اقتباس کا آخری جملہ خاصا قابل غور ہے۔ میر اور غالب کی ذہنی ساخت اور طرز فکر میں کوئی مماثلت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دونوں کا تخلیقی دور ایک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ غالب کا طرز فکر میر جیسا نہیں ہے۔ غالب کے ہاں جذبہ تفکر کے زیر سایہ سفر کرتا ہے۔ جیسا کہ سلیم احمد نے کہا ہے کہ جذبے کو عقل اور منطق کے مراحل سے گزارنے کا میلان غالب کے یہاں اتنا شدید ہے کہ وہ روحانی اور مابعد الطبیعاتی تجربوں کی دلیل بھی مادی اور معروضی تجربوں میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ [۳۴]

اس حوالے سے خود فاروقی صاحب نے اپنے مضمون ''غالب اور جدید ذہن'' میں لکھا ہے کہ اردو شاعری میں دماغ کی کارفرمائی کا عمل، جس کی انتہا، اور اکثر روکھی پھیکی انتہا، اقبال کے یہاں ملتی ہے، غالب نے شروع کیا تھا۔ [۳۵] اس کی مثالیں خود فاروقی صاحب نے شعر شور انگیز میں بھی دی ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر غالب پر بیدل کا اثر نہ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ میر کے تجریدی اشعار سے بھی غالب نے استفادہ کیا ہوگا۔ لیکن چونکہ عام طور پر میر کا تخیل ٹھوس اور مرئی اشیا سے کھیلتا ہے، اس لیے ان کی فارسیت غالب سے مختلف طرح کی ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اردو کے بیشتر تصوراتی اور تجریدی الفاظ فارسی الاصل ہیں، اس لیے غالب کی فارسیت ان کی تجریدیت کے لیے سونے پر سہاگہ بن گئی۔ [۳۶]

شعر شور انگیز کی غزل نمبر ۳۲ کا تیسرا شعر:

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی

میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب نے اس مضمون کو بہت بہتر انداز میں کہا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کا انداز پر اسرار اور مفکرانہ ہے۔دوسرے مصرعے میں ایک نازک تمثیل بیان ہوئی ہے۔میر کا شعر ان صفات سے خالی ہے۔[۳۷]

لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض معاملات میں غالب کا مرتبہ میر سے بلند تر ہے، لیکن اس کے باوجود غالب کو میں خدائے سخن نہیں کہتا، بعض حالات میں میر کو خدائے سخن کہہ سکتا ہوں۔[۳۸] اس جملے میں واضح تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے۔یہاں تذبذب اور جانب داری کا عنصر واضح نظر آرہا ہے بلکہ اس جملے کو پڑھ کر فوراً غالب کا شعر یاد آجاتا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

لکھتے ہیں کہ غالب کا وہ شعر جس میں انہوں نے میر کے دیوان کو "کم از گلشنِ کشمیر نہیں" کہا تھا، ان کے زمانہ نوجوانی کا ہے۔اور وہ شعر جو گلشنِ کشمیر والے شعر سے زیادہ مشہور ہے، وسط عمر کا ہے، کیوں کہ یہ غزل ۱۸۴۷ اور ۱۸۵۰ کے درمیان کی ہے۔اس کی تحریر کے وقت غالب کی عمر پچاس سے کچھ کم یا زیادہ تھی۔میری مراد اس مقطع سے ہے:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ان حقائق کے ساتھ ساتھ ہم اگر اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ غالب نے میر سے دل کھول کر استفادہ کیا ہے، اور جن غزلوں نے غالب کو غالب بنایا، ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو غالب نے تیس برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے لکھی تھیں، اور غالب کا میر سے استفادہ تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی ہے، تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غالب کے تخلیقی سرچشمے میں جو دھارے آکر ملتے ہیں ان میں بیدل اور سبک ہندی کے بعض دوسرے "بدنام" شعرا کے علاوہ میر کا دریائے ذخار بھی ہے۔[۳۹]

غالب کے ان اشعار کو بنیاد بنا کر جن میں میر کی تعریف اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہے یہ سمجھ لینا کہ غالب میر کی برتری، اپنی عاجزی اور تقلیدِ میر کا اظہار کر رہے ہیں، درست نہیں ہوگا۔

اشعار ملاحظہ ہوں:

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

پہلے شعر میں غالب نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے اور جس چیز کو وہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہ ان کی اردو شاعری کا کمال ہے اور اپنے شدید تفاخر کو کم کرنے کے لیے میر کو سہارا بنایا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''کہتے ہیں'' قابلِ غور ہے۔ یعنی میں خود نہیں کہتا بلکہ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ماضی میں کوئی میر بھی ریختے کا استاد تھا۔ دوسرے شعر میں بھی ''معتقدِ میر'' اپنی طرف سے نہیں بلکہ ناسخ کی طرف سے کہلوایا گیا ہے۔ ہاں غالب کا ایک شعر واقعی ایسا ہے۔ جس میں میر کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب کو خود بھی اپنے ریختہ پر ناز تھا جس کا اظہار اس شعر میں نظر آتا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

عظیم شاعر اپنے سے پیشتر بڑے شاعر کو خراج تحسین پیش کرتا ہے جیسے کہ اقبال نے غالب کو اور فیض اور مجید امجد نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ایک طویل پیرائے میں غالب سے میر کی مماثلتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر کی دنیا روزمرہ کے واقعات سے بھری ہوئی ہے، اور ان واقعات کو وہ ایک جذباتی

معنویت بخش دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں کی کثرت ہے۔ غالب کی دنیا اگرچہ میر ہی کے اتنی بھرپور ہے لیکن اس میں واقعات اور کرداروں کی یہ کثرت نہیں، اس لیے دونوں کا تاثر مختلف معلوم ہوتا ہے۔"[۳۰]

درحقیقت غالب کا یہ شیوہ ہی نہیں۔ وہ تو کثرت میں وحدت اور انتشار میں شیرازہ بندی کا ہنر دکھانے کا ماہر ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہے کہ:

گنجینۂ معنی کا اس کو طلسم سمجھیے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

عام زبان اور شاعری کی زبان میں روزمرہ کے استعمال کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب کے یہاں روزمرہ سے دوری کا ذکر مجھے میر کی اس خصوصیت کی طرف لاتا ہے جسے میں ان کے عظیم ترین کارناموں میں شمار کرتا ہوں۔ یعنی یہ کہ میر نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنا دیا۔ یہ کام ان کے علاوہ کسی سے نہ ہوا۔۔۔ لیکن روزمرہ کی تعریف قائم کرنا ضروری ہے، ورنہ غالب کی زبان کو بھی روزمرہ کا درجہ کیوں نہ دیا جائے؟ آڈن (Auden) نے لکھا ہے کہ عام زبان تو محض اس کام آسکتی ہے کہ اس میں زندگی کے عام سوال جواب ہو سکیں۔ مثلاً یہ کہ "اس وقت کیا بجا ہے؟" یا "اسٹیشن کا راستہ کون سا ہے؟"۔۔۔ آڈن کے خیالات بڑی حد تک والیری (Valery) سے ماخوذ ہیں۔ والیری کہتا ہے کہ وہ زبان جو عام ضروریات کے لیے استعمال ہوتی ہے، وہ اپنا مقصد پورا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ بیان جس میں کسی عام، عملی ضرورت یا خیال کا اظہار کیا گیا ہو، اپنا مافی الضمیر اپنے مخاطب تک پہنچانے کے بعد بے کار ہو جاتا ہے۔۔۔

یعنی وہ بیانات جو عملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کہے یا لکھے جاتے ہیں، اپنا

مقصد پورا کرنے کے بعد غیر ضروری اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ عملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو بیانات کہے یا لکھے جاتے ہیں،ان کی صورت روزمرہ کی ہوتی ہو گی۔یاان کی حیثیت روزمرہ کی ہوتی ہوگی۔والیری کا کہنا ہے کہ یہ زبان شاعری کے کام نہیں آسکتی۔شاعری کی حیثیت زبان بنانی پڑتی ہے۔عام زبان،جسے والیری ''پبلک کی زبان'' کہتا ہے،روایتی اور غیر عقلی بیتوں اور قاعدوں کا مجموعہ ہوتی ہے،ایسا مجموعہ جو بے ڈھنگے پن اور بے قاعدگی کا خلق کردہ،ملاوٹ سے بھرپور اور ''لفظیات کے صوتی اور معنیاتی ردوبدل'' کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

والیری اسی بنا پر شاعری اور زبان اور نثر میں فرق کرتا ہے۔وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ شاعری میں بھی افکار وتصورات بیان ہوتے ہیں۔''افکار'' کی تعریف وہ یوں کرتا ہے:''فکر وہ کارگذاری ہے جو چیزوں کو ہمارے اندر زندہ کر دیتی ہے،جو وجود نہیں رکھتیں۔۔۔اور ہمیں اس بات پر قادر کرتی ہے کہ ہم جزو میں کل یا صورت کو معنی سمجھ لیں،جو ہم میں التباس پیدا کرتی ہے کہ ہم اپنے بے چارے پیارے جسم سے الگ ہو کر بھی دیکھ سکتے ہیں،افعال کو عمل میں لا سکتے ہیں،دکھا اٹھا سکتے ہیں۔۔۔'' والیری کہتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ شاعری کے تفکر کی گہرائی سائنس داں یا فلسفی کے تفکر کی گہرائی سے مختلف ہوتی ہے کہ شاعر کے شاعرانہ عمل میں تفکر اور تجرید فکر موجود ہوتی ہے،شعر سے باہر اسے تلاش کرنا فضول ہے۔تھوڑا سا غور بھی اس بات کو واضح کر دے گا کہ والیری جس قسم کے شاعر کا ذکر کر رہا ہے،وہ غالب کی طرح کا شاعر ہے۔یعنی ایسا شاعر جو ایسی زبان سے گریز کرتا ہے جو عام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔[۴۱]

اس اقتباس کے ملاحظہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب خود ہی غالب کی عظمت کا اعتراف کر رہے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب نے اپنے آپ کو بازاری،سوقیانہ،روزمرہ اور محاورات سے مملو زبان سے بچایا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے

کہ اس کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ روزمرہ اور محاورات علاقائی خصوصیات رکھتے ہیں اور ان کے استعمال کی اہمیت صرف ایک محدود علاقے اور زمانے تک ہی ہوتی ہے۔ ایسی زبان کا حامل فن جغرافیائی حدود کو توڑنے سے محروم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ غالب نہ صرف شعروں کے انتخاب کے واسطے رسوا ہوا ہے بلکہ الفاظ کے انتخاب میں بھی اسے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ دراصل غالب الفاظ میں پوشیدہ توانائی کا راز پا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کے مناسب استعمال پر اسے قدرت بھی حاصل تھی۔ ظاہر ہے جن الفاظ میں توانائی زیادہ ہوگی ان میں ادائیگی مفہوم کی شدت بھی زیادہ ہوگی۔ فاروقی صاحب خود ہی روزمرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ زبان جو تصورات (concepts) اور نازک یا باریک جذبات (subtle emotions) کو ادا کرنے کی قدرت سے کم وبیش عاری ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان میں بڑی شاعری نہیں ہو سکتی، بلکہ شاید شاعری ہی نہیں ہو سکتی۔[۴۲] لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ میر نے اپنی شاعری میں روزمرہ کا استعمال کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میر کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے روزمرہ کو شاعری کی زبان میں بدل دیا۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ روزمرہ میں شخص، ماحول اور عہد کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے، لیکن اس کی بنیادی ہیئت ہر زمانے میں ہوتی ہے، چاہے وہ مثالی اور خیالی ہی ہو۔[۴۳]

مضمون مذکور کے آخر میں خود ہی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ غالب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایسی زبان بنانا چاہتے تھے جو شاعری کی زبان ہو، یعنی جس میں علمی اور ادبی دونوں طرح کی زبانوں کی ساری قوتیں ہوں، اور کمزوریاں کوئی نہ ہوں، یا کم سے کم ہوں۔ غالب اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کی زبان آئندہ کے تمام شعرا کے لیے ایسا آئیڈیل بن گئی جس کو حاصل کرنے کی سعی ہی ان شعرا کی زندگی کا ماحصل ٹھہری۔۔۔ غالب جو زبان خلق کر گئے وہی اردو شاعری کی زبان رہی اور آج تک

ہے۔[۴۴] بعینہ ایسی بات اختر انصاری نے بھی کہی ہے کہ اگر صرف مشہور ترین اسالیب سے اعتنا کیا جائے تو ذوقؔ، مومنؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ اور آتشؔ میں سے ہر ایک کے نام اور کام کے ساتھ جو اسلوب وابستہ ہے وہ لائق ذکر اور مستحق مطالعہ قرار پائے گا کہ یہ وہ اسلوب ہیں جو نسلاً بعد نسلاً اردو کی غزلیہ شاعری پر سایہ فگن رہے اور جن کے زیر سایہ غزل اور غزل سرائی کے مستقل دبستانوں نے پرورش پائی۔ اور پھر ان سب کے آخر میں مقطع غزل کے طور پر یا کسی داستان کے نقطۂ عروج کی طرح اس عظیم اسلوب کا ذکر آئے گا جس کو ہم اسلوبِ غالب کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اور جو شعری اسالیب کی دنیا میں میں بھی ایک منارۂ نور ہے، بلند و بعید بھی اور ضو ریز و ضیا افروز بھی!

غالبؔ کے بعد اُردو غزل کی پوری ایک صدی - انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط کا زمانہ - اسالیب کے زاویۂ نگاہ سے تہلکہ و خلفشار کا زمانہ ہے۔ جس میں انتزاع و اختلال کے پہلو بہ پہلو ایجاد و اختراع کا عمل بھی پوری شدت کے ساتھ جاری رہا۔ اسالیب کی شکست و ریخت، تخریب و انہدام، ترمیم و تنسیخ اور طلوع و نمود کے اس پورے دور کو اگر ہم صحیح تناظر میں دیکھنا چاہیں تو شاید غالبؔ اور اس کے اسلوب ہی کے زاویے سے دیکھنا ہوگا، مطلب یہ کہ غالبؔ کے بعد غزل اور اسالیب غزل کی دنیا جس انتشار و بحران کا شکار رہی ہے اس کو غالبؔ اور اس کی ظالمانہ عظمت سے پیدا ہونے والے امتناعی اثرات کی روشنی میں ہی بہترین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔[۴۵]

آخر میں لکھتے ہیں کہ غالب کے زمانے میں اردو نثر بھی فروغ پا چکی تھی اس لیے اس کے پاس زبان اور الفاظ کے امکانات وسیع تھے جبکہ میر کا دوران امکانات سے محروم تھا۔ پھر میر کو سودا، حاتم اور درد کا رنگ بھی منظور نہ تھا اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد روزمرہ پر رکھی۔" اس وجہ سے میر کا لسانی کارنامہ غالب کے کارنامے سے کم تر نہیں۔ بلکہ کچھ برتر ہی معلوم ہوتا ہے۔[۴۶]

اب اگر فاروقی صاحب کے مذکورہ جواز کو درست تسلیم کیا جائے تو یہ سوال جنم لیتا ہے کہ جب ان دونوں شعرا میں زمانی بعد پایا جاتا ہے تو پھر ان کا آپس میں تقابل اور موازنہ چہ معنی دارد؟

فاروقی صاحب اپنے مضمون ''خدائے سخن، میر یا غالب'' میں لکھتے ہیں کہ غالب اور میر کے بارے میں یہ مفروضہ بھی مہمل ہے کہ میر کے کلام میں اچھے شعر خال خال ہی ہیں اور اگر انہوں نے غالب کی طرح اپنے کلام کا انتخاب کیا ہوتا تو ان کے حق میں اچھا ہوتا۔ میر کے یہاں بہتر نہیں تو دو تین ہی سو نشتر ہوں گے، یہ خیال اس لیے عام ہے کہ لوگوں نے میر کا مطالعہ بغور اور بالاستیعاب نہیں کیا۔ فراق صاحب نے بڑی فیاضی سے کام لیتے ہوئے میر کے یہاں ''قدر اول'' کے اشعار کی تعداد غالباً ڈھائی تین سو یا اس سے کچھ کم یا زیادہ بتائی ہے۔ (اس حساب کی بھی داد دینا چاہیے) مجھ سے ایک مرحوم بزرگ نقاد نے بیان کیا کہ میر کے یہاں کئی صفحے الٹنے پر ایک شعر ملتا ہے۔ میر کی ضخامت سے زیادہ ہماری کم کوشی نے اس طرح کے خیالات کو عام کیا ہے۔ اور ان خیالات کو استحکام اس مفروضے نے بخشا ہے کہ غالب کا دیوان اس لیے مختصر ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا بہت سخت انتخاب کیا تھا۔ میر بھی ایسا ہی کرتے تو اچھا ہوتا۔[۴۷]

پہلی بات تو یہ کہ لوگوں نے میر کا مطالعہ بغور اور بالاستیعاب کیوں نہیں کیا؟ اس میں یا تو میر قصوروار ٹھہرتے ہیں یا لوگ لیکن بے چارے غالب کا کوئی قصور نہیں۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ میر کے ہاں کوہ کندن وکاہ برآوردن والا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ میر کا کلیات خاصا ضخیم ہے اور اس سے دُرِ نایاب کا آسانی سے حصول کاردارد ہے۔ دوسرے یہ کہ میر کے ہاں معیار سے زیادہ مقدار کا چلن ہے اس لیے اس رطب و یابس سے گوہرِ مقصود کا ہاتھ لگنا آسان نہیں۔ اسی لیے مرحوم بزرگ نقاد نے جو کہا وہ درست کہا۔

اس امر کا اظہار خود فاروقی صاحب نے ''شعر شور انگیز'' جلد اول کے دیبا۔چے میں کیا ہے کہ اصول یہ رکھا کہ غزل کی صورت برقرار رکھنے کے لیے مطلع ملا کر کم سے کم تین شعروں کا التزام رکھوں۔ جہاں صرف دو شعر انتخاب کے لائق نکلے، وہاں تیسرا شعر (عام اس سے کہ وہ مطلع ہو یا سادہ شعر) بھرتی کا شامل کرلیا اور شرح میں صراحت کردی کہ کون سا شعر بھرتی کا ہے۔ جہاں ایک ہی شعر نکلا، وہاں ایک پر اکتفا کی۔ اس لیے کوشش کے باوجود اس انتخاب میں مفردات کی تعداد خاصی ہے۔[۴۸] لیکن دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر پورا کلیات، بغور پڑھا جاتا تو حقیقت کھل جاتی کہ میر کے یہاں اگرچہ ہر شعر رتبۂ اعلیٰ کو نہیں پہنچا ہوا ہے، لیکن کلام کا اوسط معیار پھر بھی اس قدر بلند ہے کہ خود کلیات ہی انتخاب کا حکم رکھتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے اشعار چار ہزار سے یقیناً کم نہیں ہیں، اور کلیات کے کم سے کم اسی فی صدی اشعار اچھے شعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ زیر نظر انتخاب کی ضخامت کم رکھنے کے لیے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔[۴۹] مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں واضح تضاد اور تناقص پایا جاتا ہے۔

خود شاعر کا اپنے اشعار کا انتخاب کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اس عمل میں آپ اپنا تماشائی بننا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھنا پڑتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے لیے اپنے کلام کے کچھ حصے کو حذف کرنا ایسے ہی ہے جیسے اپنے جسم کے کسی حصے کو الگ کر دینا۔ کیوں کہ شاعر کے لیے اس کے اشعار اولاد معنوی کا درجہ رکھتے ہیں اور اولاد جتنی بھی بری ہو اس کو آسانی سے گھر سے نہیں نکالا جا سکتا۔ یہ انھی کا کام ہے جن کے حوصلے زیادہ ہوتے ہیں۔ غالب میں یہ ہمت مخالفین کے طعنوں اور بہتر تنقیدی صلاحیتوں کی بنا پر پیدا ہوئی۔ فاروقی صاحب کا یہ الزام کہ اگر وہ شروع کا کلام چھانٹ نہ دیتے تو بھی ان کا کلیات میر کے دیوان اول سے زیادہ ضخیم نہ ہوتا۔ لہٰذا غالب کے کلیات اردو کا اختصار اس بنا پر نہیں ہے کہ انہوں نے سخت انتخاب کر کے کمزور شعر نکال دیے تھے۔[۵۰] حقیقت یہ ہے کہ غالب کی

شاعری کا تین چوتھائی حصہ فارسی پر مشتمل ہے اور اپنی فارسی شاعری پر ہی انہیں فخر بھی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگو راز مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

گو یہ الگ بات کہ اس شعر میں ذوقؔ سے معاصرانہ چشمک کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ہر فن کا نابغہ خود نقاد ہوتا ہے۔ ایک تخلیق دوسری تخلیق سے اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اس کے خالق کا تنقیدی شعور دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔ شعر شور انگیز کی سبھی جلدوں میں فاروقی صاحب نے اپنی ساری توانائیاں صرف اس بات پر صرف کی ہیں کہ میر کی شاعری تمام دنیا کی شاعری سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور دنیا کا کوئی شاعر میر کی طرح ہمہ گیر شخصیت کا مالک نہیں۔ جیسا کہ میر نے خود بھی اپنی ایک مثنوی ''اژدرنامہ'' میں اپنی یکتائی کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ ایک اژدہا ہے اور دیگر شعرا اس کے سامنے حشرات الارض کی سی حیثیت رکھتے ہیں:

یہ موذی گئی نا خبردار فن
نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن
نہیں جانتے ہوں میں مارسیاہ
زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ

اس بارے میں جاوید رحمانی لکھتے ہیں کہ فاروقی نے میر کی ہمہ گیری کا جو تصور پیش کیا ہے اور میر کے دائرہ اظہار کو جس طرح پھیلایا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پھر کسی شاعر کو پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟ میر کا کلام کافی ہے۔[۵۱]

اس ضمن میں انہوں نے میر کا تقابل دنیا کی سبھی معروف زبانوں اور ان کے معروف شعرا سے کیا ہے جن میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، یونانی اور برصغیر کی دیگر علاقائی زبانیں بھی شامل ہیں۔ شعر شور انگیز'' پر بات کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مبسوط تجزیے اور تعبیر میں کوشش کی ہے کہ یہ

ایک ایسا عمدہ انتخاب بھی عمل میں آجائے جو کلام میر کے ہر رنگ اور ہر تیور کی عکاسی کر سکے۔اس ضمن میں انہوں نے ان گنت مقامات پر دوسرے شاعروں کا میر سے موازنہ بھی کیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ موازنے کے اس انداز سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ میر کی عظمت کو ہر قیمت پر مستحکم کرنا چاہتے ہیں،خواہ اس عمل میں بڑے اہم شاعروں کی انفرادیت کو اس طریق کار کی بھینٹ ہی کیوں نہ چڑھانی پڑے۔وہ یوں تو یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں میر کو اس کے مسوں اور مہاسوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں مگر جب وہ میر کے شعر کو عملی تنقید کی کسوٹی پر کستے ہیں تو ان کو میر کے اوسط یا کم درجے کے شعر بھی کسی نہ کسی پہلو کے باعث درجۂ اول کے شعر ہی نظر آتے ہیں۔[۵۴]

اب آخر میں اس حوالے سے ''شعر شور انگیز'' چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔غزل نمبر ۹۲ کا پہلا شعر:

آنسو تو ذرے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا

''غالب کا شعر یقیناً میر سے مستعار ہے:

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لیکن غالب کے یہاں مراعات النظیر ،اور دوسرے مصرعے میں ''نکلا'' کا ابہام بہت خوب ہے۔اس کے علاوہ،غالب نے براہ راست آنسو پینے کا ذکر نہیں کیا ہے،بلکہ پورے واقعے کی طرف اتنا بلیغ اشارہ کیا ہے کہ داستان خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔میر کے یہاں ایک خوبی غالب کی طرح ہے کہ انہوں نے قطرۂ آب کو براہ راست فاعل قرار دیا ہے۔غالب کے شعر میں وہ قطرہ طوفان بن جاتا ہے،یعنی اپنا عمل خود ہی کرتا ہے۔استعجاب اور رنج دونوں کے یہاں بہت خوب ہے۔غالب نے ''پھر'' کا لفظ رکھ کر ایک مسلسل عمل کی

طرف اشارہ کیا ہے۔ میر کا شعر اس خوبی سے خالی ہے۔ اس کے برخلاف، ڈر کی وجہ سے آنسوؤں کا دب جانا اور خود ڈر کی وجہ مخفی رکھنا میر کے شعر کی وہ خوبی ہے جو غالب کے یہاں نہیں۔ [۵۳]

غزل نمبر ۱۱۶ کا شعر:

لڑکے جہان آباد کے یک شہر کرتے ناز
آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

''یک شہر'' کا محاورہ غالب کے اس شعر کی وجہ سے بہت مشہور ہوا ہے:

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کا شعر لاجواب ہے۔ لیکن ''جہان آباد'' (جو ایک شہر ہے) کے اعتبار سے ''یک شہر'' میں جو لطف ہے، وہ غالب کے یہاں نہیں، کیوں کہ غالب کے شعر میں شہر، بستی یا کسی آبادی کا تلازمہ نہیں ہے اور ''یک شہر'' مجرد استعمال ہوا ہے۔ [۵۴]

غزل نمبر ۱۴۳ کا شعر:

چتون بے ڈھب آنکھیں بھری ہیں پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
عشق ابھی کیا جانئے ہم کو کیا کیا میر دکھاوے گا

''پلکوں سے بھی نظر چھوٹی'' کا مضمون غالب نے براہ راست اٹھالیا ہے:

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بہت سے لوگوں کو غالب کے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ میر کا شعر اگر سامنے ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی۔ غالب نے حسب معمول مضمون کو نیا رنگ دے دیا ہے اور اس میں اپنی مخصوص ڈرامائیت اور پیچیدہ وسعت پیدا کردی ہے، لیکن اولیت کا شرف

میر کو ہے۔[۵۵]

اس حوالے سے ممتاز حسین کا ایک جملہ ذہن میں آتا ہے کہ:

> میر کا رہنما عشق، غالب کا رہنما خرد، ایک کا سفر روبہ تسخیر نفس، دوسرے کا سفر روبہ تسخیر شش جہت، ایک کو بے خودی جہاں در جہاں، دوسرے کو تشت خورشید بر سر ہوش۔[۵۶]

فاروقی صاحب نے تنقیدِ میر میں زیادہ تقابل غالب ہی سے کیا ہے اور ہر جگہ کوئی ایسا نکتہ سامنے لائے ہیں جس سے غالب کی نسبت میر کی برتری نظر آئے۔ حالانکہ ''تفہیمِ غالب'' کے سلسلے میں ان کا اندازِ تنقید یکسر مختلف ہے۔ اس میں وہ جان کاہی اور موشگافیاں نظر نہیں آتیں جو ''شعر شور انگیز'' کے صفحے صفحے پر نظر آتی ہیں۔ جس طرح ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ''محاسنِ کلامِ غالب'' میں نعرۂ مستانہ بلند کیا اور غالب کا موازنہ دنیا کے ہر بڑے شاعر سے کیا تھا بالکل وہی انداز شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ''شعر شور انگیز'' میں اس فرق کے ساتھ اپنایا ہے کہ بجنوری کے یہاں جس قدر شدید اختصار پایا جاتا ہے، فاروقی صاحب کے ہاں اتنا ہی انتشار اور پھیلاؤ پایا جاتا ہے جو بعض اوقات ناگواری کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز (جلد اول، تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۲۳

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، اشاعت سوم، تصحیح شدہ ایڈیشن، ۲۰۰۵، ص ۲۰، ۲۱

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میر کی شعری روایت، مشمولہ، بنیاد، لمز، لاہور، پاکستان، جلد دوم، شمارہ ۲، ۲۰۱۲، ص ۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، خدائے سخن، میر کہ غالب؟ مشمولہ، شعر شور انگیز بحولہ بالا ۱، ص ۲۹

۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غالب کا ذوق تماشہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷، ص ۸۲

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میر کی شعری روایت، مشمولہ، بنیاد، لمز بحولہ بالا ۳، ص ۱۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز بحولہ بالا ۱، ص ۲۵۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میر کی شعری روایت، مشمولہ، بنیاد، لمز بحولہ بالا ۳، ص ۱۵

۱۷۔ شمس الرحمن فاروقی، غالب کی میری، مشمولہ شعر شور انگیز بحوالہ بالا ۱، ص ۴۹
۱۸۔ شمیم حنفی، غالب کی تخلیقی حسیت، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص ۵۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۲۳۰
۲۰۔ ایضاً، ص ۵۶
۲۱۔ شمس الرحمن فاروقی، میر کی شعری روایت، مشمولہ، بنیاد، لمز بحوالہ بالا ۳، ص ۱۷
۲۲۔ شمس الرحمن فاروقی، غالب اور جدید ذہن، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر بحوالہ بالا ۲، ص ۳۷۴
۲۳۔ اختر انصاری۔ غزل اور غزل کی تعلیم، تیسری اشاعت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۰، ص ۸۴، ۸۵
۲۴۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز بحوالہ بالا ۱، ص ۱۰۱
۲۵۔ شمس الرحمن فاروقی، میر کی شعری روایت، مشمولہ، بنیاد، لمز بحوالہ بالا ۳، ص ۱۶
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۸
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۷
۲۹۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز بحوالہ بالا ۱، ص ۳۶
۳۰۔ ایضاً، ص ۳۵
۳۱۔ شمس الرحمن فاروقی، اردو شاعری پر غالب کا اثر، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر بحوالہ بالا ۲، ص ۳۶۵
۳۲۔ جاوید رحمانی، غالب تنقید، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۱۸۰
۳۳۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز بحوالہ بالا ۱، ص ۳۲
۳۴۔ شمیم حنفی، غالب کی تخلیقی حسیت، بحوالہ بالا ۱۸، ص ۱۱۷
۳۵۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر بحوالہ بالا ۲، ص ۳۷۶
۳۶۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز بحوالہ بالا ۱، ص ۶۹
۳۷۔ ایضاً، ص ۲۷۶
۳۸۔ ایضاً، ص ۳۰
۳۹۔ ایضاً، ص ۴۳، ۴۴
۴۰۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۱۔ ایضاً،ص۵۴، ۵۵

۴۲۔ ایضاً،ص۵۶

۴۳۔ ایضاً،ص۵۶

۴۴۔ ایضاً،ص۵۷، ۵۸

۴۵۔ اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم،بحوالہ بالا۴۳،ص۸۴

۴۶۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز،بحوالہ بالا۱۱،ص۵۸

۴۷۔ ایضاً،ص۴۰

۴۸۔ ایضاً،ص۴۰

۴۹۔ ایضاً،ص۴۱

۵۰۔ ایضاً،ص۴۱

۵۱۔ جاوید رحمانی، غالب تنقید،بحوالہ بالا۳۲،ص۱۸۱

۵۲۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، میر تنقید اور تنقیدی رویے، مشمولہ میر تقی میر: منتخب مضامین، مرتبین، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان،۲۰۱۰،ص۳۸۷، ۳۸۸

۵۳۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز،بحوالہ بالا۱۱،ص۳۷۸، ۳۷۹

۵۴۔ ایضاً،ص۵۳۳

۵۵۔ ایضاً،ص۶۰۹

۵۶۔ ممتاز حسین، غالب ایک مطالعہ، انجمن ترقی اُردو کراچی۔۲۰۰۳،ص۸

سوانح غالب پر معاندانہ تحریریں

سوانح غالب پر معاندانہ تحریریں

غالب کو جیتے جی ایک طرف ہمیشہ اپنی ناقدری کا شکوہ رہا تو دوسری طرف تادمِ مرگ حریفوں کے معاندانہ رویے کا سامنا بھی رہا۔ اس صورتِ حال کو وجود میں لانے میں شائبہ تقدیر کے علاوہ کچھ اُن کی اپنی اَنا کا بھی دخل تھا۔ ابتدا میں اُن کی شاعری کو مہمل، لغو اور مشکل قرار دیا گیا اور اُن پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی گئیں۔ جن کا ذکر محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ''آبِ حیات'' میں بھی کیا ہے۔ ایک دفعہ مرزا (غالب) بھی مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیشؔ ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزاؔ سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس کی بنا پر غالب یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور ذوقؔ کے معاملے میں یہ کہنا پڑا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
شاعری کچھ ذریعۂ عزت نہیں مجھے

طرزِ نو اختیار کرنا کارِ مشکل ہے۔ اِسے وہی اختیار کر سکتے ہیں جن کے حوصلے زیاد ہوتے ہیں۔ غالب آئینِ نو کے متلاشی تھے۔ ایسے شخص کو ہر طرف سے معاشرے کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ دیدہ ورکی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نہ صرف نرگس ہزاروں سال روتی ہے بلکہ دیدہ ور کو بھی زمانے کی کئی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے غالب کی شاعری کو مہمل، اُس کے اندازِ فکر کو نامانوس اور اس کے اسلوبِ حیات کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا۔

غالب کے فن کے ساتھ ساتھ اس کی شخصی زندگی کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ غالب کے اسلوبِ حیات پر تنقید کی ابتدا سفرِ کلکتہ سے ہوتی ہے۔ کلکتہ میں پہلے تو مشاعرے میں قتیل کے شاگردوں سے علمی معرکہ آرائی ہوئی، اُس کے بعد ان کی شخصی زندگی پر حملہ کیا گیا۔ دروغ گوئی کا الزام لگایا گیا اور اُن کے بیانات کو مشکوک ٹھہرایا گیا۔ مخالفین نے یہ اعتراض کیا کہ یہ شخص دو تخلص رکھتا ہے لہٰذا اس کے بیانات کی صداقت مشکوک ہے۔ اس ضمن میں غالب کو دفترِ عدالت میں وضاحت کرنا پڑی جس کا ذکر انہوں نے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہ امر مخفی نہ رہے کہ جب مجھ (غالب) خاکسار کا ستارۂ بدبختی کلکتہ پہنچا تو ستم گرانِ وطن میں ایک بدطینت نے مجھ سے پیشتر ہی اس جگہ ۔۔۔۔ (قیاسی: موجود تھا) اور جو ارکانِ عدالت سے شناسائی کا دم بھرتا تھا، یہ مشہور کر دیا کہ اس رنجور نے، کہ دہلی سے وارد ہوا ہے، نہ صرف اپنا نام، بلکہ تخلص بھی بدل ڈالا ہے، (چنانچہ) صاحبانِ بارگاہ کو دفتر کدے کے حاکم کے سامنے اس بے حیثیت کا نام پیش کرنے میں تامل ہوا۔ ناچار میں نے اپنا اُردو غزل کا دیوان، جس کی تالیف کو سات سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے اور جس پر اس روسیاہ کی مہروں میں سے ایک مہر تھی، "اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ" مع "۱۲۳۱ ہجری" ۔۔۔۔ دفتر کدے کے حاکم اعلا

کے پاس بطور شہادت بھجوادیا۔(۱)

کلکتہ میں غالب کا معاشرتی سطح پر بھی مضحکہ اڑایا گیا اور سر بازار اُن پر لعن وتعن کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ کلکتہ کے مشاعرے کے حوالے سے خلیق انجم لکھتے ہیں کہ:

> غنڈہ گردی اور شہدپن پر آمادہ ان لوگوں نے غالب کی یہ حالت کر دی کہ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ ان پر آوازیں کستے۔اس ذلت ورسوائی کی وجہ سے اردو اور فارسی کا یہ عظیم شاعر نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گیا۔(۲)

کلکتہ میں مخالفین نے غالب کو ہر طرح سے زچ کرنے کی کوشش کی اور چوطرفہ حملے کیے۔نہ صرف زبانی بلکہ تحریری طور پر بھی بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ:

> مخالفوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات 'جام جہاں نما' نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا چھاپ دی تھیں۔(۳)

غالب نے 'جام جہاں نما' میں اپنے خلاف شائع ہونے والی تحریر کے بارے میں ایک فارسی خط میں لکھا ہے کہ آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ 'جام جہاں نما' دیکھا (اس میں میرے خلاف جو کچھ چھپا ہے) اُس سے سوائے بے آبروئی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے بھی وہ اوراق ملاحظہ کیے ہوں گے۔ واللہ باللہ ثم تاللہ مجھ مسکین کے بارے میں ان اوراق میں جو کچھ مندرج ہے، وہ سب محض جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی ہے۔(۴)

ولیم فریزر کے قتل اور اُس کی پاداش میں نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی کی سزا کا واقعہ بھی غالب کو بدنام کرنے کا سبب بنا۔ ولیم فریزر دہلی کے مجسٹریٹ تھے۔ غالب کا ان سے دوستانہ تھا۔ جب کہ نواب شمس الدین احمد خاں، نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے جن سے غالب کو اپنی پنشن کی حق تلفی کی بنا پر شکایت تھی۔ دوسری طرف نواب شمس الدین احمد خاں کے سوتیلے بھائی نواب امین الدین احمد خاں سے غالب کا یارانہ تھا۔ مذکورہ دونوں

بھائیوں کا جائیداد کے حوالے سے آپس میں جھگڑا اچل رہا تھا۔اس زمانے میں شاید غالب پر مخبری کا الزام بھی لگایا گیا۔غالب کے ایک اہم سوانح نگار غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ''غالب'' میں بھی غالب پر مخبری کے شبے کے حوالے سے تاسخ کے نام خط کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مخبری کی ہو(۵) لیکن غالب کے خط سے اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

تاسخ کے استفسار پر غالب نے تاسخ کو لکھا کہ:

> دراصل میں اس دوران میں لوگوں کے اپنے کیفر کردار کو پہنچنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔جاگیردار میوات کو اس کے نائب کریم خاں کی طرح پھانسی کے تختے پر لٹایا گیا۔جس نے جو بویا تھا وہی کاٹا۔(۶)

مخبری کے ضمن میں جب پروفیسر حمید احمد خان نے دہلی میں نواب خضر مرزا سے دریافت کیا تو انہوں نے فوراً کہا! مخبری؟ ہم نے تو کوئی ایسا ذکر کبھی سنا نہیں۔ہاں البتہ فتح اللہ بیگ خاں کا نام اس سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔(۷)

حیاتِ غالب میں کچھ اخبارات تو غالب کے طرف دار تھے جن میں احسن الاخبار، بمبئی اور اودھ اخبار، لکھنؤ سرِ فہرست تھے جب کہ مخالفت میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار پیش پیش تھا۔غالب کو گھر پر قمار بازی کروانے کی لت پڑی ہوئی تھی۔۱۸۴۱ء میں چھاپہ پڑنے پر پکڑے بھی گئے۔اِس واقعہ کی خبر اُس دور کے تقریباً بھی اخبارات نے دی۔کیوں کہ دہلی اردو اخبار شیخ ابراہیم ذوق کا طرف دار تھا اور اس کے مالک اور مدیر مولوی محمد باقر کے ذوق سے گہرے مراسم تھے لہٰذا اس اخبار کی ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں مذکورہ واقعہ کی خبر خوب مرچ مسالہ لگا کر پیش کی گئی اور صحافتی خبر نگاری کے اصولوں کو بھی لائے طاق رکھا گیا۔نہ صرف پکڑنے والے تھانے دار کی تعریف وتحسین کی گئی بلکہ اُس کے مستقبل کے حوالے سے بھی استفسارات کیے گئے۔

خبر ملاحظہ ہو:

> سنا گیا کہ ان دنوں گزر قاسم خاں قمار بازاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے، جو سابق بُری علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا، لیکن بہ سبب رعب اور کثرت مرداں یہ کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہ ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سید اور بڑا جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعہ دار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔ بہت بے طمع ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ شمس الدین خاں قاتل ولیم فریز رصاحب کے قرابتِ قریب سے ہیں۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید۔ لیکن ان تھانے دار کی خدا خیر کرے دیانت کو تو کام فرمایا انہوں نے، لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھوٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبالِ جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔ (۸)

قاطع برہان کے خلاف تحریری اور تقریری طور پر ایک سلسلہ دراز چلا۔ قتیل کی لغت برہانِ قاطع پر اعتراضات کی شکل میں غالب نے "قاطع برہان" لکھ کر پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور سے اور پھر اس میں مزید اضافے کر کے ۱۸۶۵ء میں مطبع اکمل المطابع سے "درفش کاویانی" کے نام سے شائع کروائی۔ قاطع برہان کا شائع ہونا تھا کہ غالب کے خلاف ایک طوفانِ بدتمیزی کھڑا ہو گیا۔ جس کا نکتۂ عروج "قاطع القاطع" (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) ہے۔ یہ ایک ہنگامہ خیز تصنیف تھی جس کے مصنف مولوی امین الدین امین

تھے۔انہوں نے ''برہان قاطع'' کی حمایت میں غالب کے اعتراضات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔اس کا لہجہ انتہائی نازیبا،درشت اور تلخ تھا اور دشنام گوئی سے بھی احتراز نہیں کیا۔بقول ڈاکٹر اکبر حیدری:

> امین نے غالب کے ''سچیہ'' کے جواب میں اپنی کتاب میں ''تادیب'' کا لفظ استعمال کیا۔موصوف نے ''تادیب'' میں غالب کے خلاف بہت ہی ناشائستہ اور قابلِ اعتراض زبان کا مظاہرہ کیا ہے اور گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کیا۔(۹)

غالب نے ''قاطع القاطع'' کے مصنف پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی لیکن جب کامیابی کی امید نہ رہی تو راضی نامہ داخل کر دیا۔جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا،ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب وشتم بھیجنے شروع کیے،جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن وملامت لکھی ہوتی تھی۔اُن دنوں میں مرزا کی عجیب حالت تھی:نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے،اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اس قسم کا خط نہ آیا ہو،ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔(۱۰)

قاطع برہان کے رد میں پانچ کتابیں فارسی نثر میں لکھی گئیں جن میں آخری کتاب مولوی احمد علی کی ''شمشیر تیز تر'' ہے جو غالب کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں دہلی سے شائع ہوئی اور بقول مالک رام اگر مرزا غالب زندہ رہتے تو یہ بحث چندے اور جاری رہتی۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ:

> قاطع کے شائع ہوتے ہی جامد خیال مقلدوں کے لشکر غالب کے خلاف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ان میں سے کوئی یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ غالب نے کیا لکھا ہے یا اصولِ فارسی کے لحاظ سے اس کی حقیقی

> حیثیت کیا ہے۔سب محض اس وجہ سے جوش میں آ گئے کہ غالب کو صاحب برہان قاطع کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ اس سلسلے میں غریب غالب نے چھوٹے پیمانے پر وہ تمام مصیبتیں برداشت کیں جو تقلید و جمود کے راستے سے الگ ہو کر چلنے والوں کو ہر عہد اور ہر دور میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں۔(۱۱)

کلکتے کے ادبی معرکے کے بعد غالب نے بیدلؔ کا تتبع ترک کر دیا بلکہ بیدلؔ کے اثر سے آزاد ہونے کی شعوری کوشش بھی کی، یہ اور بات ہے کہ کلی طور پر وہ خود کو بیدلؔ کے اثر سے آزاد نہیں کر سکے۔اس موضوع پر بات کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں کہ:

> غالب نے جو کچھ بیدلؔ کے بارے (مخالفت) میں کہا تو بیدل کے مداحین کو بہت ناگوار گزرا۔دو کتابیں اس حوالے سے لکھی گئیں ایک "اسرار حسن" محمد احسن کی اور دوسری "نمونہ مغلوبیت غالب" از شنکر پرشاد جوشؔ کی۔۔۔ "عود ہندی" کی طباعت کے بعد اگر غالب سال دو سال اور زندہ رہ جاتے تو عین ممکن تھا کہ ایسا ہی ایک اور ادبی معرکہ وجود میں آ جاتا جو کلکتے کے ادبی معرکے اور "قاطع برہان" کے معرکے کی یاد تازہ کر دیتا۔(۱۲)

یہ واقعات غالب کی زندگی میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔غالب کی موت کے بعد ان واقعات میں مزید اضافہ ہوا اور مرنے کے ایک ماہ بعد ہی ان کی شخصی زندگی پر وار کیا گیا۔آگرہ سے ایک ماہ وار رسالہ "ذخیرۂ بال گوبند" کی مارچ ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں ایک مضمون غالب پر شائع ہوا جس میں غالب کے مذہب کے حوالے سے الزام تراشی کی گئی کہ:

> ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اُتار کر حلیۂ فری مسن سے آراستہ ہوا تھا۔ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیاری اور کیفیت فری مسن ہوں کی، دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی، پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔(۱۳)

اُردو شعرا کے تذکروں میں بھی میں چند ایک میں غالب کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا گیا ہے جن میں سرفہرست قطب الدین باطن کا تذکرہ "گلشن بے خزاں" اور تاریخی نام "نغمۂ عندلیب" ہے جس سے تذکرے کا سالِ آغاز ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس تذکرے میں غالب کو نظیر اکبر آبادی کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ نظیر غالب کے استاد تھے اب وہ مر گئے اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا اقرار کریں۔ باطن کے اس بیان کی بنا پر بعد کے کچھ محققینِ غالب نے بھی نظیر کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے "شرح دیوانِ غالب" کے دیباچے میں باطن کے اس دعوے کی تائید کی ہے۔ اس ضمن میں مالک رام نے اپنی تصنیف "ذکرِ غالب" (ص ۳۸) میں جرح وتعدیل سے کام لے کر اس امکان کو رد کر دیا ہے۔ نظیر کی شاگردی کے حوالے سے درگاہ پرشاد نادر دہلوی نے اپنے تذکرے "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" میں لکھا ہے کہ:

> ان کی نسبت صاحبِ گلشن بے خزاں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ شخص نظیر اکبر آبادی اور اس کے بیٹے گلزار اسیر (متوفی ۱۸۷۹ء) کے شاگرد ہیں۔۔۔۔ تو اکثر شعرائے دہلی نے کہا یہ بھی غلط ہے۔ واقعی غالب نے اشعارِ اُردو کے لیے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ (۱۴)

اس تذکرے میں باطن نے غالب کی شخصی زندگی کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے اور غالب کی ذاتی خامیوں کو بھی خوب اچھالا ہے۔ غالب کی شراب نوشی، انا اور خودی، ذو تخلص اور بدمذہبی کو بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> آپ (غالب) دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دلا دھرتے ہیں۔۔۔۔ گو فارسی میں تین ہیں۔ پر اُردو میں تو ذوق ہی نکتہ چیں ہیں۔ جس طرح طبیعت آئی اس کی خاک اڑائی چنانچہ دختر رز سے جو تاک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شراب شفق قاضیِ آفتاب بے ادب کش لایا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو چھٹے جواری ہوئے۔۔۔ دہلی

والے، صاحب کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے۔ مارے خودی اور تبختر کے جی میں پھولے نہیں سماتے۔ پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو۔ ان کو شراب وکباب چاہیے۔ خلاف شرح بے حساب چاہیے۔ روزے کے نام سے انہیں کیا کام۔ نماز کو ان کے ہر دم سلام۔ (۱۵)

شعرا کے تذکروں میں بھی معاصرانہ چشمکوں کا سلسلہ چلتا رہا ہے اور باطن بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ اسی چشمک کے حوالے سے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

ان کے والد (بقول باطن) غالب سے دوستانہ تعلقات تھے اور باطن غالب کے دوست کالے صاحب کے مرید تھے لیکن انہوں نیا اپنے تذکرہ گلشن بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب میں غالب کو بہت بُری طرح یاد کیا ہے۔۔۔۔ شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں نظیر کا جس طرح ذکر کیا تھا وہ باطن کو جو نظیر اور غالب ان کے بیٹے اسیر کے بھی شاگرد تھے، ناگوار گزرا تھا اور یہ تذکرہ گلشن بے خار کے رد میں لکھا گیا تھا۔ باطن نے ان ہم عصروں کو جن کی شیفتہ نے خاص طور پر تعریف کی ہے چن چن کر سخت دست کہا ہے۔۔۔ اس کی تحریر میں صریح تناقص موجود ہے۔ نظیر کا استاد غالب ہونا بھی قابلِ قبول نہیں۔ (۱۶)

اسی طرح نواب صدیق حسن نے اپنے تذکرے "شمع انجمن" (مطبوعہ شاہ جہانی بھوپال ۱۲۹۳ھ ص ۵۰) میں لکھا ہے کہ "شیعی داشت۔۔۔۔ و ہیچ وقت خود را از شراب مدام و گردش جام معاف نمی گذاشت"۔ (۱۷) یعنی شیعہ مذہب تھا۔ کسی وقت شراب پینے سے باز نہیں رہتے تھے۔ تذکروں میں آخری تذکرہ "آبِ حیات" ہے جس میں حالاتِ غالب قدرے تفصیل سے فراہم ہوئے ہیں۔ ذیل میں اُن اقتباسات کو درج کیا جاتا ہے جو غالب کی شخصی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے، جو دوستوں

> سے۔ اُدھر ہونہار جوانوں کا مودب بیٹھنا اِدھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا۔ اُدھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حد ادب سے قدم نہ بڑھانا، اُدھر پھر بھی شوخی طبع سے باز نہ آنا ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ (۱۸)

غالب اپنی وسیع المشربی کی بنا پر مذہب کے حوالے سے ہمیشہ تضادات کا شکار رہے۔ اسی بنا پر تا حال محققین غالب بھی کسی ٹھوس اور واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ حالی نے یادگار غالب میں اپنے متضاد بیانات سے اس مسئلے کو مزید الجھا دیا۔ یوں غالب کا مذہبی پہلو لاینحل ہو کر رہ گیا ہے۔ آزاد نے غالب کو شیعہ مذہب ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنت و جماعت تھا، مگر اہلِ راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا کہ طہور اس کا جوشِ محبت میں تھا، نہ کہ تبرا اور تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انہیں تفضیلی کہتے تھے اور وہ سن کر خوش ہوتے تھے۔۔۔۔ تمام اقربا اور حقیقی دوست سنت و جماعت تھے، لیکن ان کی اپنایت میں کسی طرح کوئی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخر الدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہلِ دربار میں کبھی اس معاملے کو نہیں کھولتے تھے۔ (۱۹)

غالب کے انتخابِ دیوان کے ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد، مولوی فضل حق خیر آبادی کے ساتھ ایک اور شخص مرزا خانی کو لے آتے ہیں جو قتیل کے شاگرد تھے۔ چونکہ غالب کو قتیل سے خدا واسطے کا بیر تھا اس لیے آزاد نے "آب حیات" میں کچھ یوں انداز اپنایا ہے کہ

> مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر اچھی لکھتے ہیں۔۔۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ شعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا! اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا خیر ہوا، سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال

ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (۲۰)

مولانا آزاد کا بیان درست نہیں۔ دیوانِ ریختہ کا انتخاب خود غالب نے کیا اور عرشی صاحب کے حوالے سے یہ امر تحقیق ہو چکا ہے کہ غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب خود انجام دیا۔ آزاد کے مذکورہ بیان کے حوالے سے عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ اولاً تو نسخۂ عرشی زادہ، نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرانی، گُلِ رعنا اور نسخۂ رام پور قدیم کا مطالعہ اس کی توثیق نہیں کرتا۔ دوسرے خود مرزا صاحب نے اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ دیوانِ ریختہ کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ "همانا، نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخابِ دیوانِ ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد"۔ اس امر کی تائید ڈاکٹر وحید قریشی کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:

عرشی صاحب کے بیان کے مطابق غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کی جمع و تدوین کا ابتدائی کام خود انجام دیا (وہ آزاد کی اس روایت کو نہیں مانتے کہ غالب کے احباب نے اس کا کلام منتخب کیا) فی الحقیقت ان کا موقف صحیح بھی ہے۔ (۲۱)

تذکروں کے بعد پہلی کتاب جس میں غالب کی شخصی زندگی پر اعتراضات کیے گئے ہیں "غالب (حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحقیق)" ہے۔ جسے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے تحریر کیا۔ اس تصنیف کا باب پنجم "غالب کا زاویہ نگاہ زندگی کے متعلق" کے عنوان سے ہے۔ جس میں غالب کی قصیدہ گوئی، مالی حوالے سے عدم سیر چشمی اور مذہب کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ موصوف غالب کے قصائد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنانے کی کوشش کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کی مزاج داری سے وہ بے پرواہ نہیں رہا۔ جس شخص

کی آنکھوں نے دہلی کے اجڑنے اور بہادر شاہ جیسے مربی کی جلاوطنی کے عبرت ناک تماشے دیکھے اس کا قلم برادران برطانیہ کے قصیدہ خوانی میں بھی مصروف نظر آتا ہے۔کیا یہ قصائد ہمیں کوئی بات سمجھا سکتے ہیں؟ کیا اس خط وکتابت کا بھی کھوج لگایا جاسکتا ہے جو ہمارے شاعر اور حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں میں ہوئی۔(۲۲)

غالب ایک گدائے مبرم کی طرح اپنی پنشن اور خلعت ودربار کی واگزاری کے لیے انگریز حکام کو عرضیاں اور قصیدے بھجواتا رہا۔جیسا کہ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ: انھوں (غالب) نے انگریزوں کی خدمت میں قصیدے بھیجے جو دراصل منظوم عرضیاں ہیں۔(۲۳)

اسی طرح خط وکتابت کا کھوج یہ ہے کہ وہ پنشن کے حصول کی غرض سے تھیں نہ کہ کوئی سیاسی گٹھ جوڑ کے حوالے سے۔

کیونکہ یہاں بھی سوال ثنا گوئی اور مدح گستری سے زیادہ "جیغہ وسرپیچ ومالائے مروارید" کا تھا یا دربار لبرا اور خلعت کا۔(۲۴)

غالب کی پست ہمتی اور تنگ حوصلگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللطیف لکھتے ہیں کہ:

دوستوں اور مربیوں کی مالی اعانت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی لیکن اس کے دل میں قناعت کی لہر تک پیدا نہیں ہوئی۔۔۔لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے ربانی کا شکر گزار تھا اور نہ کسی انسانی خدمات کا۔خلاف مردانگی وہ ہمیشہ کڑھتا ہی رہا۔۔۔۔(مثنوی ابرِ گہر بار) یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں رحمت الٰہی کو جوش دلایا گیا ہے کہ وہ اس کی بشری کمزوری کو بخش دے۔اس مقام پر امید تھی کہ غالب کا سرنیاز جھک جائے گا۔۔۔لیکن غالب ایسا کیوں کرنے چلا تھا۔وہ پھر کرالٹے خدا ہی کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف وحوصلہ سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا۔یہاں تک کہ وہ عطیات ربانی کا

شکریہ بھی ادا نہیں کرسکتا۔(۲۵)

سوانح عمریوں میں عبدالصمد صارم الازہری کی "مقامِ غالب" پہلی سوانح عمری ہے جس میں اول تا آخر سوانح غالب کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ نسبتاً ایک مختصر سوانح عمری ہے۔ جس کے آغاز میں "التماس" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ غالب کو خواہ مخواہ نقادوں نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے حالانکہ ان کو پوری قدرت اردو زبان پر بھی نہ تھی۔

اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

> میں نے اعتراضات کو تہذیب کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ چوں کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب یہ دور غالب پرستی کا ہے اس لئے میری اس تصنیف کے ساتھ جو سلوک ہوگا مجھے اس کا اندازہ ہے۔ اس کے خلاف مضامین لکھے جائیں گے۔ رسائل واخبارات تبصرہ کرنے میں کند چھری سے کام لیں گے۔(۲۶)

افسوس کہ موصوف کو اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا جو اندازہ تھا وہ شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ تا حال ماہرین غالبیات نے اس تالیف کو درخوراعتنا نہیں سمجھا۔ مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موٗلف نے یہ کتاب اس لئے لکھی کہ کم ازکم مخالفین غالب میں تو شمار ہوگا جیسا کہ یاس یگانہ چنگیزی نے "غالب شکن" لکھ کر شہرت حاصل کی تھی۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حالات غالب، غالب کی شاعری کا تاریک پہلو، غالب کی شاعری کا روشن پہلو اور "نتیجہ" شامل ہیں۔

"مرزا غالب کی تعلیم اور اساتذہ" کے عنوان میں لکھا ہے کہ ہرمزد کو میں نہیں جانتا۔ اس ضمن میں پہلے نظامی بدایوانی کی کتاب "نکات غالب" سے حوالہ دیا ہے کہ عبدالصمد ضرور ایک پارسی نو مسلم تھا۔ پھر لکھا ہے کہ:

> کیا تماشا ہے کہ صاحب معاملہ کو تو انکار ہے اور وہ (غالب) بلا تکلف وتصنع بیان کر رہا ہے لیکن کم وبیش بہتر برس کے بعد نظامی صاحب کو اصرار ہے

اور وہ اس کو بلا دلیل خرافت قرار دیتے ہیں۔ لکھتے تو ہیں کہ عبد الصمد ضرور پارسی عالم تھا مگر کوئی حوالہ نہیں دیتے کہ اس عبد الصمد کے وجود حالات کا انہیں کہاں سے پتہ چلا۔ (۲۷)

اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے نسب و کمال پر غرور تھا۔ نظیر کے تلمذ سے اپنی کسر شان سمجھ کر ابتدائی زمانے میں ایک زبردست عالم فرض کر کے اپنا استاد قرار دیا کہ لوگ انہیں بے استادہ کہنے سے باز رہیں جب وہ خود خوب روشناس ہو گئے تو انہوں نے امر حق کا اظہار کر دیا۔ شیخ معظم زیادہ مشہور نہ تھے۔ نظیر ضرور مشہور تھے لیکن اس زمانہ میں لوگ ان کو اچھے اساتذہ میں شمار نہ کرتے تھے اس لئے مرزا کو ان کا نام لیتے ہوئے شرم آئی اور ایک فرضی استاد گھڑنے کی ضرورت پیش آئی۔

بات یہ ہے کہ غالب نے عبد الصمد کا ذکر بچپن میں نہیں بلکہ قریب قریب ساٹھ سال کی عمر میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک مضحکہ خیز امر یہ کہ ایک طرف نظیر مشہور تھے لیکن ساتھ ہی اس زمانہ میں لوگ ان کو اچھا استاد نہ سمجھتے تھے۔ یہ بھی کیسا عجیب تضاد ہے۔

''مرزا غالب دہلی میں'' کے بیان میں مالک رام اور مہر سے اختلاف کر کے پروفیسر آغا حیدر حسن کے ایک مضمون سالنامہ، رسالہ آج کل ۱۹۴۷ء دہلی) کا حوالہ دیا ہے کہ ستائیس اٹھائیس برس کے اس وقت ہوں گے جو غلط ہے۔ تخلص کے بیان میں لکھا ہے کہ سد تخلص سے مرزا کبھی بیزار نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اس تخلص کو کبھی ترک کرنے کا رادہ کیا۔

''مرزا غالب کے مذہب'' کے بیان میں لکھتے ہیں:

مرزا کا آبائی مذہب سنت و جماعت تھا لیکن مرزا کے کلام، خطوط و حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کلمہ گو مسلمان ضرور تھے۔ مگر کسی مسلک کے پابند نہ تھے۔ جیسے ضرورت دیکھتے بن جاتے تھے۔ (۲۸)

اب موصوف کی ابوالعجبیاں ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں کہ انہوں نے قلعہ میں باریابی کی

کوشش کی جب کامیاب نہ ہوئے تو یہ تدبیر کی کہ ظفر بادشاہ کے مرید ہوگئے۔ جب مرزا نے واجد علی شاہ سے تعلق پیدا کرنا چاہا اور ادھر رام پور میں نواب یوسف علی خان مسند نشین ہوئے تو مرزا علی علی کرنے لگے۔ اس زمانے کے جس قدر خطوط وغیرہ ہیں سب شیعیت سے لبریز ہیں۔ جب یوسف علی خان مر گئے اور نواب کلب علی خان والئی ریاست ہوئے تو چونکہ یہ سنی المذہب تھے مرزا صاحب کہنے لگے۔

شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

حقیقت یہ ہے کہ غالب کالے میاں کے مرید تھے۔ دوسرے یہ کہ قیام کلکتہ کے دوران لکھے گئے فارسی خطوط میں بھی شیعیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جب کہ یوسف علی خان سے تعلقات تقریباً تیس سال بعد استوار ہوئے۔ مذکورہ مصرعہ اس رباعی کا ہے جو غالب نے شیعیت سے اپنی بریت کے لیے بہادر شاہ ظفر کے لئے لکھی تھی نہ کہ نواب کلب علی خان کے لیے۔

مذہب کے حوالے سے اپنے باپ کی روایت کو بیان کیا ہے کہ

> والد صاحب نے بیان کیا ہے کہ ۱۸۹۹ء میں اخ مکرم حافظ حاجی محمد ابراہیم صاحب مرحوم دہلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ فراش خانہ میں مرزا اکبر بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں میں دہلی گیا۔ مرزا اکبر بیگ کہنہ سال بزرگ وجیہ اور صاحب استعداد آدمی تھے۔ شام کو دیوان خانہ میں بیٹھتے۔ دوست احباب آجاتے، مختلف قسم کی باتیں ہوتیں۔ ایک دن مرزا غالب کے مذہب کا ذکر ہوا تو مرزا اکبر بیگ نے کہا کہ جعفر دہلوی نے مرزا غالب پر یہ چوٹ کی تھی۔

ب اسے جانتے ہیں وہ ہے رکابی مذہب
اس کو لالچ کوئی دے گا تو وہ ڈھل جائے گا

یہ جعفر علی مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کے پھوپھا تھے۔(۲۹)

"مرزا کی شاعری کی ابتدا" میں مہر کے حوالے سے لکھا ہے کہ لال کنھیا کا بیان ہے یہ مثنوی جب لکھی تھی تو غالب کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اب پتنگ کی مثنوی کو دیکھیے جو ہشت سالہ معصوم کی تصنیف ہے زبان کس قدر صاف ہے۔ طرز ایسا اچھا کہ نظیر اکبر آبادی سے ٹکر کھاتا ہے۔ یہ معصوم صنعتِ رعایت لفظی سے بھی خوب واقف ہے۔

غالب کی اردو کے بارے میں اس طرح گل فشانی کی ہے:

> لیکن جس قدر یہ معصوم عمر میں ترقی کرتا ہے اردو میں ترقی معکوس کرتا ہے۔ اردو بھول جاتا ہے ایسی اردو لکھتا ہے کہ جسے کسی طرح بھی اردو نہیں کہا جا سکتا۔(۳۰)

"کاشف الحقائق" مرتبہ امداد امام سے حوالہ دے کر لکھا ہے کہ جب ناسخ کا دیوان دہلی میں پہنچا۔ غالب کی غزل گوئی کی ابتدا تھی۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ انیس سال کی عمر میں غزل گوئی شروع کی۔ میر کی روایت کو بھی درست تسلیم نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

> اس روایت کے لکھنے والوں نے بھی تحقیق کی تکلیف گوارا نہیں کی اور یہ بھی خیال نہیں کیا اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ میر نے کہا کہ اگر اس کو کوئی استاد کامل مل گیا تو یگانہ روزگار ہوگا ورنہ مہمل گو ہو جائے گا۔ مرزا غالب خود لکھتے ہیں کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں تو اب نتیجہ کیا سمجھنا چاہیے۔(۳۱)

نابغہ خود اپنا استاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا فضل حق خیر آبادی اور شیفتہ جیسے عالم لوگ غالب کے ہم مجلس تھے۔ انہی لوگوں کی صحبت سے غالب راہ راست پر آئے۔ مالک رام نے جس تحقیقی انداز سے اس روایت کی معقولیت ظاہر کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

> مرزا صاحب نے شمس الامراء کو ۱۸۵۳ء میں جو خط لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ تیس برس سے فارسی لکھتا ہوں جب سے فارسی لکھنا شروع کیا اردو سے

طبیعت ہٹ گئی۔ مثنوی پتنگ نظیر اکبرآبادی کی معلوم ہوتی ہے انہوں نے شاگردعزیز کے نام سے اس کوخوش کرنے کولکھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظیر سے ان کاتعلق خاص تھا۔(۳۲)

موصوف نے اپنی تحقیق کو بار دینے کے لیے گلستان بے خزاں کے موئف قطب الدین باطن کا حوالہ دیا ہے۔اس ضمن میں مالک رام نے باطن اور ذکا کے تذکرے عیار الشعرا کی تحریریں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ سچ اور جھوٹ کیا ہے۔پھر لکھتے ہیں کہ غرض یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب مولوی معظم اور نظیر دونوں کے شاگرد تھےاور جس طرح انہوں نے اپنا استاد ایک فرضی علامہ ہرمز پارسی عرف عبدالصمد نام بتایا ہے اسی طرح مبداء فیاض پر بھی اتہام کیا ہے۔غالب کی ذہنی کم مائیگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا نے جوروش ابتدا میں اختیار کی تھی وہ کسی طرح قبول خاطر اور پسند عام نہیں ہو سکتی۔مرزا ایک مدت کے بعد اپنی روش سے خبردار ہوئے۔مدت دراز تک کام کی حقیقت سے آگاہ نہ ہونا اور جس کی پیروی کرنی ہو اس کی روش کو نہ سمجھنا اور برسوں تک غلطی میں مبتلا رہنا اس پر خبردار نہ ہونا ذہن رسا اور طبع سلیم کی شان سے بعید ہے۔

شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ مرزا نے ذوق کومخاطب کر کے کہا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذراز مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

اور بادشاہ سے عرض کیا

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

جوشخص عقل سلیم سے مرزا کے واقعات پر غور کرے گا وہ ان اشعار پر یہی کہے گا کہ مرزا چونکہ اردو شاعری میں اپنے معاصرین کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔اس لئے یہ بات بنائی۔انہوں نے (۶۵) برس

تک اپنے شوق سے اردو میں جدوجہد کی۔ بادشاہ کے دربار سے ان کا تعلق
۱۸۵۰ء سے ہوا جب کہ ان کی شاعری کی عمر (۴۵) سال تھی (۳۳)

شاعری (اردو) ترک کرنے کی اصل وجہ غالب کی انا اور ذوق سے چشمک کی تھی۔ دوسرے شعر غالب کے سہرا لکھنے کے حوالے سے ہے۔ اس ضمن میں غالب نے ظفر کی ناراضی کی بنا پر بارہ اشعار کا قطعہ لکھ کر حضور میں پیش کیا۔ یہ ایک قسم کا صفائی نامہ تھا۔

''نسخہ حمیدیہ'' کے بارے میں اعتراض کیا ہے کہ مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ وہ 'پہلا دیوان' چاک کر دیا یہ ان کی پچیس برس کی عمر کا واقعہ ہے۔ جب انہیں کوئی جانتا بھی نہ تھا اس لئے اس نسخہ کا وجود یا کسی کے پاس اس کی نقل کا موجود ہونا اگر بیان کیا جائے تو دور از صداقت ہوگا۔۔۔ ان واقعات وحالات پر نظر کرنے کے بعد مرزا کے مداحوں کی کارستانی کو دیکھئے کہ کس طرح باتیں بنائی ہیں جو بروئے واقعات و تاریخ کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتیں۔ بیدل کی پیروی کے ضمن میں لکھتے ہیں ''مرزا غالب زبان پر قادر نہ تھے نہ ایسے ذہین وطباع تھے جیسے کلیم ومحب وغیرہ نہ اس قدر ذی علم ثابت ہوئے اس لئے ان سے بیدل کی پیروی نہ ہو سکی۔ لوگ مرزا کے ساتھ بیدل پر بھی برس پڑتے ہیں۔ یہ کیا انصاف ہے۔ منتخب دیوان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا غالب چوں کہ مشہور آدمی تھے اس لئے لوگوں کا خیال تھا کہ دیوان ضخیم ہوگا جب شائع ہوا تو دو ورقی مجموعہ نکلا اس پر ایک معاصر نے چوٹ کی۔

ڈیڑھ جز پر بھی تو رہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہوتا

کچھ عجب نہیں کہ اس طنز سے متاثر ہو کر مرزا نے یہ شعر کہا ہو۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ظاہر ہے کہ دیوان انتخاب شدہ ہے اور حشو و زاید سے پاک ہے اور دوسرے شعر کا

سیاق و سباق کچھ اور ہے۔ موصوف نے عدم واقفیت کی بنا پر محض قیاس سے کام لیا ہے۔

غالب کی مثنویوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ایک مثنوی آموں کی تعریف میں ہے اس کے (۳۳) شعر ہیں۔ یہ بھی بڑے استاد کے شایان شان نہیں۔ مسٹر عطا اللہ لکھتے ہیں (عالمگیر ی خاص نمبر نومبر ۱۹۴۳ء) مگر خود غالب ہی کو مثنوی سے کیا علاقہ تھا۔ (۳۴)

غالب نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں مثنوی "ابر گہر بار" سر فہرست ہے۔ گو یہ مثنوی نامکمل ہے اور تقریباً گیارہ سو اشعار پر محیط ہے لیکن بلاشبہ مضمون اور فکر کی جدت و ندرت کی بنا پر ایک شاہکار ہے۔ مؤلف نے ڈاکٹر سید عبداللطیف اور یگانہ کی خوب تعریف کی ہے، مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مذکورہ بالا اصحاب ہی غالب کے فن اور شخصیت کو سمجھ سکے ہیں۔ انھی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر معاملات پر معقولیت اور راستی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

غالب کی شاعری کے ضمن میں بے جا تاویلیں پیش کر کے غالب کے فن کو گندہ کرنے کی ناپاک سعی کی ہے۔ اسی طرح نثر میں املا اور قواعد کی خود ساختہ اور مضحکہ خیز غلطیاں نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب تو اردو کی صرف و نحو سے ہی واقف نہ تھے۔ شارحین غالب کو سخت سست، بے عقل اور خیالی کہہ کر مٹی پلید کی ہے۔ اشعار غالب کو خود ساختہ غلط مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے۔ حالی اور بجنوری پر بے جا تنقید کی ہے کہ یہ لوگ شاعری کے فن کو ہی نہیں سمجھتے۔

دوسری سوانحی کتاب امیر حسن نورانی کی مرتبہ "غالب کی زندگی" ہے جس میں غالب کی شخصی زندگی کے عیوب پیش کیے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

> ابتدا میں اخلاقی تعلیم و تربیت کی طرف جو غفلت ہوئی۔ اس نے غالب میں بہت سے اخلاقی عیوب پیدا کیے۔ جو ایک اچھے انسان کے شایان شان نہیں سمجھے جاتے۔ آج غالب کی بڑائی اردو و فارسی کے ایک

شاعر اور ادیب کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے، بحیثیت انسان اگر ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو خوبیاں کم نظر آئیں گی۔ (۳۵)

غدر اور قصائد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

انہوں (غالب) نے انگریزوں سے لڑنے والوں کو دل کھول کر برا بھلا لکھا اور انگریزوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ قومی نقطۂ نظر سے غالب کی زندگی اور ان کی قومی غیرت کا یہ ایک تاریک پہلو ہے کہ ذاتی مفاد اور عیش و آرام کے حصول کے لالچ میں ملک کی غلامی اور قوم کی تباہی پر افسوس کرنے کے بجائے ظالموں اور زبردستوں کی تعریف کرتے رہے اور دعائیہ قصیدے لکھ کر پیش کرتے رہے۔ (۳۶)

غالب کے انگریز حکام کے ساتھ روابط کے حوالے سے مرتب نے ان کو ایک معیاری خوشامدی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وہ ہر قیمت پر انگریز حکام کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور اس حد تک آگے بڑھ جاتے تھے کہ کوئی خوددار آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود غالب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ بڑے خوددار تھے۔ مگر عملی زندگی میں وہ ایک معیاری خوشامدی ثابت ہوئے جس کا ثبوت ان کے حالاتِ زندگی سے بخوبی ملتا ہے۔ بہرحال جہاں غالب ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے اور ان میں بعض اور خوبیاں بھی تھیں وہاں ان کی زندگی کے تاریک گوشے بھی ہیں جہاں وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ترک کر کے بہت پست جگہ پر نظر آتے ہی تھے۔ (۳۷)

اخلاق و عادات کے ضمن میں غالب کی ضد اور ہٹ دھرمی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کی عادت تھی کہ اپنی رائے کے مقابلہ میں دوسروں کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اپنی قابلیت اور واقفیت پر ان کو کسی حد تک غرور تھا، اسی لیے بعض باتوں میں چاہی وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنی ہٹ پر قائم رہتے

تھے۔(۳۸)

یہ بیان مکمل طور پر درست نہیں۔غالب میں لچک موجود تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ دوستوں کے کہنے پر فکر شعر میں تبدیلی لائے۔اپنے اردو دیوان کا انتخاب کیا،اس ضمن میں حالی غالب کی ''حق پسندی'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا،یا کوئی عمدہ تعریف ان کے شعر میں کرتا تھا۔اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔مثنوی درد و داغ میں ان کا ایک مصرع تھا۔:''خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد'' جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطق مکرانی کو بھیجی تو اس نے مرزا کو لکھا:خوک سم دارد،نہ پنجہ۔اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرسود۔'' مرزا نے اس جواب میں صاف لکھا ہے کہ ''اگر کلیات فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا اور اس مصرے کو یوں بنا دیتا''خوک شد و بد نفسی ساز کرد'' چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا،تو انہوں نے یہ مصرع اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے:

ہم چناں در تحقق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا نے خود لکھا ہے کہ میں نے خود نمونے کی جگہ ثبوتے لکھا تھا۔مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیاں ثابتہ کیلئے نمود کا لفظ مناسب ہے۔اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔چنانچہ طبع ثانی میں انہوں نے نمود کی جگہ ثبوت بنا دیا۔اس طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے:

عید اضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد'' مرزا نے اول عید قرباں لکھا تھا۔پھر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے کہنے پر اسے عید اضحیٰ بنا دیا گیا حالانکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورہ سخن کرتے تھے۔(۳۹)

غالب کی خودداری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان میں خودداری سے زیادہ خوشامد زیادہ تھی۔

> انگریزی تہذیب اور معاشرت کو سراہا، بخلاف اس کے ہندوستانی معاشرت اور یہاں کے طور طریقوں کی برائی کرتے تھے۔۔۔ یہ ان کی زندگی کا تاریک گوشہ ہے جسے بعض لوگ غلط تاویلیں کر کے روشن کرنا چاہتے ہیں۔ مگر غالب کے قلم نے جو کچھ لکھا ہے، پہلے اس کو غلط ثابت کرنا پڑے گا جو ممکن نہیں۔ (۳۰)

اے عزیز نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف پاکستان'' میں غالب کو انگریزوں کے وفادار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ابتلا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کر کے ہندوؤں کے پاس بیچ دی گئیں جس سے برطانوی فوجی خزانے میں دو لاکھ ستر ہزار پونڈ کا مزید اضافہ ہوا۔ دلی شہر کے رہنے والوں کو جو بیماریوں اور فاقوں کے باوجود زندہ تھے شہر سے نکال دیا گیا۔ اور جب شہر میں لوٹ آنے کی اجازت ملی تو حکم دیا گیا کہ کوئی مسلمان شہر میں رات بسر نہ کرے۔ مگر اردو شاعر غالب کو، جس کی دشمنانِ اسلام کے ساتھ وفاداری میں کوئی شبہ نہ تھا، شہر میں ٹھہرنے کی خاص اجازت دی گئی۔ (۳۱)

مزید آگے چل کر لکھتے ہیں:

> غالب کی نثر اور شاعری بے بضاعتی اور بے حسی کا شاہکار ہیں۔۔۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے۔ فرنگی آقاؤں کی بدولت اس شاعر کو مسلمانوں کے قومی شاعر کا مقام حاصل ہوا۔ (۳۲)

انیس ناگی نے اپنی تصنیف ''غالب پریشاں'' میں غالب کی امراؤ بیگم سے ان بن، ہاتھ میں خوشبو ۱۸۵۷ء اور غالب کی قمار بازی پر بھی بات کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے غالب کے بیانات کو رد کیا ہے۔ غالب کی قمار بازی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

غالب کی بیان کردہ تفاصیل متضاد بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں۔ وہ اس موقف پر مُصر تھے کہ قمار بازی کا قصہ محض غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور انہیں سہواً سزا دی گئی۔ اپنی اسیری کے بعد غالب اس کی تفصیل میں دانستہ طور پر اخفا برتتے رہے ہیں۔ گھنشام داس عاصی کی معاصر شہادت غالب کے اس بیان سے مختلف ہے۔ عاصی کے مطابق جیل میں برے حال تھے۔ ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر سول سرجن نے طبی بنیادوں پر غالب کی قبل از وقت رہائی کی سفارش کی تھی۔ (۴۳)

اسی طرح وہ غالب کے اس موقف کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ گرفتاری محض غلط فہمی کی بنا پر ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں کہ:

۱۸۴۷ء جولائی کی اسیری سے پہلے اس سال جون کے مہینے میں بھی غالب قمار بازی میں گرفتار ہوئے تھے لیکن بچ نکلے تھے۔ ۱۸۴۱ء میں بھی غالب قمار بازی میں گرفتار ہوئے تھے۔ اگر مورخین اور محققین کی ان تواریخ کو معتبر تصور کر لیا جائے تو غالب کا یہ موقف خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔۔۔۔ غالب کے تمام اہم سوانح نگاروں (حالی، غلام رسول مہر، ایس ایم اکرام) نے غالب کے بیان پر اعتماد کر کے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ وہ قمار باز نہیں تھے، کبھی کبھار شرط لگا لیا کرتے تھے۔ جوا، گنجفہ وغیرہ اس عہد کے امیر زادوں کا ایک مشغلہ تھا۔ اس قسم کے بیان اور نتائج ہیرو پرستی کی نفسیات کے مظہر ہیں۔ حالی تو اس حد تک مبالغہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کی اسیری برائے نام تھی اور انھیں تمام طرح کی سہولتیں حاصل تھیں، حالی یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ غالب کو قید بامشقت ہوئی تھی۔ غالب کے حبسیہ سے گمان گزرتا ہے کہ غالب سے رسیاں بنوانے کی مشقت بھی لی گئی تھی اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ اس کی بڑی شہادت خود غالب کا حبسیہ ہے جو انہوں نے زندان میں لکھا تھا۔ (۴۴)

غالب کی سیرت کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے انیس ناگی نے انہیں ایک موقع پرست شخص کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے مفاد کے حوالے سے وہ کسی ضابطۂ اخلاق کے پابند نہیں رہتے۔ دنیاوی جاہ و حرص ان پر حاوی تھی اور وہ اس کے لیے ہر قسم کی حدود پھلانگ سکتے تھے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غالب ایک خارجیت پسند بوہیمین تھے اور ان کے ضابطۂ اخلاق میں قمار بازی کوئی مذموم فعل نہیں تھا۔ وہ دوستوفسکی کی طرح اپنی قسمت بدلنا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے وہ اس میں بھی ناکام رہے۔(۴۵)

غالب کی زندگی پر مخالفانہ تحریریں زیادہ تر ان کے مذہب، شاگردی، قصیدہ نگاری اور انگریز حکام سے تعلقات کے حوالے سے ہیں اور ان میں حقیقت سے زیادہ تعصب کا عنصر نظر آتا ہے۔ دوسرا نمایاں پہلو غدر کے حوالے سے ہے۔ جس میں غالب کے مصلحتانہ رویے کو ملک دشمنی قرار دیا گیا۔ بظاہر یہ درست بھی ہے کہ غالب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے طرف دار تھے لیکن اس طرف داری کی وجوہات کا ایک خاص پس منظر بھی ہے جسے مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

حواشی

۱۔ پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، ترتیب متن فارسی، سید اکبر علی ترمذی، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۱۹۹۹ء ص ۱۵۵

۲۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۵ء ص ۱۵

۳۔ ابوالکلام آزاد، نقش آزاد، مرتب، غلام رسول مہر، بحوالہ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، بحولہ بالا ۲، ص ۱۳۵

۴۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ بحولہ بالا ۲، ص ۱۳۹

۵۔ غلام رسول مہر، غالب، لاہور: شیخ مبارک علی بک سیلر، ۱۹۶۳ء ص ۵۷

۶۔ مرزا اسداللہ خاں غالب، پنج آہنگ، محمد عمر مہاجر (مترجم) کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۹ء ص ۹۷

۷۔ پروفیسر حمید احمد خان، مرقع غالب، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۲۰۰۳ء ص ۵۱

۸۔ اکبر علی خاں، غالب اپنے معاصر اخبارات میں، مشمولہ "نقوش" غالب نمبر ۱۱۱، فروری ۱۹۶۹ء ص ۶۳۸

۹۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، نوادر غالب، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۲ء ص ۷، ۸

۱۰۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء ص ۴۸

۱۱۔ غلام رسول مہر، غالب، بحولہ بالا ۵، ص ۳۳۶

۱۲۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ بحولہ بالا ۲، ص ۲۷۶

۱۳۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، نوادر غالب، بحولہ بالا ۹، ص ۷

۱۴۔ درگاہ پرشاد نادر دہلوی (مرتب) خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم، مشمولہ غالب تذکروں میں از ضمیر نیازی، قومی زبان، کراچی، ص ۹۲

۱۵۔ قطب الدین باطن، گلشن بے خزاں، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ ص ۱۷۳

۱۶۔ قاضی عبدالودود، جہان غالب، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء ص ۴

۱۷۔ نواب صدیق حسن، شمع انجمن، بھوپال: مطبع شاہ جہانی، ۱۲۹۳ھ ص ۵۰

۱۸۔ مولوی محمد حسین آزاد، آب حیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء ص ۴۰۷

۱۹۔ ایضاً،ص۳۰۹
۲۰۔ ایضاً،ص۳۱۱
۲۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی،منذر غالب،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۰ء،ص۱۰۷
۲۲۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف،غالب،نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ،۲۰۰۲ء،ص۱۳۲،۱۳۳
۲۳۔ خواجہ احمد فاروقی،یاد و بود غالب،نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ،۲۰۰۲ء،ص۱۳۴
۲۴۔ ایضاً،ص۱۱
۲۵۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف،غالب،بحوالہ بالا۲۲،ص۱۸۰
۲۶۔ عبدالصمد صارم الازہری،مقامِ غالب،لاہور: نقوش پریس،اپریل ۱۹۶۸ء،ص۱۱
۲۷۔ ایضاً،ص۱۶
۲۸۔ ایضاً،ص۲۲
۲۹۔ ایضاً،ص۲۳
۳۰۔ ایضاً،ص۲۷
۳۱۔ ایضاً،ص۲۸
۳۲۔ ایضاً،ص۲۹
۳۳۔ ایضاً،ص۳۱
۳۴۔ ایضاً،ص۱۳۱
۳۵۔ امیر حسن نورانی،غالب کی زندگی،آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶،جنی ۱۹۶۹ء،ص۱۳
۳۶۔ ایضاً،ص۳۵
۳۷۔ ایضاً،ص۴۸
۳۸۔ ایضاً،ص۶۲
۳۹۔ مولانا الطاف حسین حالی،یادگارِ غالب،بحوالہ بالا۱۰،ص۷۷،۷۸
۴۰۔ امیر حسن نورانی،غالب کی زندگی،بحوالہ بالا۳۵،ص۶۳۔۶۴
۴۱۔ بحوالہ،جیلانی کامران،غالب کی تہذیبی شخصیت،راولپنڈی: خالد اکیڈمی،۱۹۷۲ء،ص۵۵
۴۲۔ ایضاً،ص۵۵
۴۳۔ انیس ناگی،غالب پریشاں،لاہور: مکتبہ جمالیات،۱۹۹۳ء،ص۱۳۵،۱۳۶
۴۴۔ ایضاً،ص۱۴۷
۴۵۔ ایضاً،ص۱۵۰

غالب کی ''دستنبو'' کی غرض وغایت

غالب کی ''دستنبو'' کی غرض و غایت

دستنبو کے ذریعے ایک طرف برِ عظیم کو جنگِ آزادی کی تاریخی دستاویز فراہم ہوتی ہے تو دوسری طرف غالب کی شخصیت کی دو جہتوں کا علم ہوتا ہے۔ ایک وہ غالب جو ''دستنبو'' کا خالق ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں اس دور کے اُردو خطوط میں نظر آتا ہے۔ بقول غالب، دستنبو غدر کا روزنامچہ ہے۔ شاید اسی بنا پر اس کا اسلوب اور آہنگ کچھ اور ڈھنگ کا ہے جب کہ ۱۸۵۷ء کے بعد خطوطِ غالب کی نوعیت اور رنگ ڈھنگ کچھ اور طرح کا ہے۔ دستنبو اور خطوط میں موضوع اور نفسِ مضمون کی یکسانیت تو پائی جاتی ہے لیکن دونوں میں مواد کے حوالے سے بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اُس دور کے خطوط میں جو غالب نظر آتا ہے وہ دہلی کی تباہی پر نوحہ کناں ہے۔ دہلی کی تباہی اُس کے لیے تیرِ نیم کش بن چکی ہے۔ دوست احباب کا بچھڑنا اس کے لیے سوہانِ روح بن چکا ہے۔ اس دور کے ہر خط میں وہ یادِ ماضی کے عذاب سے خود بھی گزرتا ہے اور قارئین کو بھی گزارتا ہے۔ پرانی صحبتیں اور دہلی کے اجڑنے کا غم اس کو مرتے دم تک رہا۔

غالب کی ''دستنبو'' غدر کے حالات کا تذکرہ ہے۔ غالب خود اس ہنگامے کے چشم دید گواہ تھے۔ اس پُر آشوب دور میں نہ صرف خود غالب متاثر ہوئے بلکہ دہلی شہر نے بھی اپنی تباہی کی رسمِ دیرینہ کو تازہ کیا۔ ممکن ہے کہ غالب نے ابتداء میں دستنبو کا آغاز محض روزنامچے کی شکل میں کیا ہو لیکن بعد میں حالات کی کروٹ بدلنے کے ساتھ دستنبو کے نفسِ مضمون میں بھی تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ اب غالب نے اس تصنیف میں اپنی غرض و غایت کو زیادہ

اہمیت دینا شروع کردی۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصنیف غدر کے حالات سے زیادہ غالب نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے لکھی۔اصل مقصد حکام کی ہمدردیوں کو سمیٹنا تھا اوران کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا تھا۔بقول شیخ محمد اکرام:

> سوانحی دل چسپی کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔کیونکہ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔جوشروع سے اخیر تک ہنگامۂ غدر میں شریک رہااور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن معترف ہیں۔لیکن یہ خیال کہ مرزانے اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اورآزادی سے لکھ دیے ہوں گے صحیح نہیں۔(۱)

شیخ محمد اکرام کے اس بیان کی تصدیق کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا بیان ملاحظہ ہو۔وہ لکھتے ہیں:

> اگرچہ غالب نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ دستنبوان کا روزنامچہ ہے جسے وہ آغاز انقلاب سے لکھ رہے تھے۔مگر دستنبو میں بہت سی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روزنامچہ ہرگز نہیں۔غالب نے اسے صرف چند دن میں لکھا ہے۔(۲)

''دستنبو'' کی ابتدا میں ہی غالب اپنے ذہنی اور قلبی میلانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بندہ حقیر انگریز کا نمک خوار ہے اور بادشاہ دہلی سے میرا تعلق صرف ''تیموری تاریخ'' کے لکھنے تک محدود ہے۔دستنبو میں لکھتے ہیں:

> کتاب کا ناظر جان لے کہ میں قلم کی جنبش کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھیرتا ہوں۔بچپن سے انگریزی حکومت کا نمک خوار ہوں۔گویا جب سے میرے منہ میں دانت آئے ہیں۔میں نے ان فاتحین عالم کے خوان (کرم) سے روٹی پائی۔(۳)

غالب نے قلعہ معلی سے اپنے تعلق کو بھی انتہائی بیزار کن انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے پر یہ مترشح ہو کہ یہ تعلق برائے نام ہی تھا۔حالانکہ غالب ۱۸۳۷ء سے ہی قلعہ

معلیٰ تک رسائی کے لیے تگ و دو کر رہے تھے اور آخر کار حکیم احسن اللہ خان کی سفارش پر ۱۸۵۰ء کو تیموری تاریخ لکھنے پر مامور ہو گئے۔ لیکن انہوں نے دستنبو میں لکھا ہے کہ سات آٹھ سال پہلے بادشاہ دہلی نے مجھے اپنے پاس تیموری تاریخ لکھنے کے لیے بلایا۔ مطلب یہ کہ میں خود نہیں گیا بلکہ بلایا گیا۔ اس تعلق سے بریت کے لیے غالب کا پیرایہ اظہار ملاحظہ ہو:

> ناچار ہفتے میں ایک دو بار قلعے جاتا اور اگر بادشاہ محل سے باہر آتا تو کچھ دیر خدمت میں کھڑا رہتا ورنہ دیوانِ خاص میں تھوڑی دیر بیٹھتا اور آتا اور جتنا کچھ اس دوران میں لکھ لیا ہوتا اپنے ساتھ لے جاتا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔ (۴)

دستنبو میں غالب نے کہیں بھی انگریزوں کی سفاکی کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہیں مظلوم اور بے بس قرار دیا ہے۔ انگریزوں کے قتل کے حوالے سے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے۔ جس سے خود بخود ان سے ہمدردی کا عنصر جنم لیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> مٹھی بھر خاک بھی نہ رہی جو گل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو اور کسی باغ کا ایک کونہ بھی نہ تھا جو بے برگ باری کے سبب بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا تھا۔ ہائے وہ عاقل و عادل نیک طینت و نیک نام حاکم اور آہ وہ خوب صورت نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی طرح اور جسم کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے اور حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ جن کے شگفتہ چہرے پھولوں کو شرمائے اور جن کی سبک گامی چکور کی چال پر حرف گیری کر رہی تھی، کہ یہ سب دفعتاً خون کے بھنور میں جا ڈوبے دفتا کے انگارے برسانے والی شعلہ سامان موت کہ جس کے ہاتھوں لوگ اپنے منہ نوچتے اور کپڑے کالے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر ان مقتولوں کے سرہانے نالہ و بکا کرے اور ان کے سوگ میں سیہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ (۵)

غالب نے اس تصنیف میں بہادر شاہ ظفر کی بریت بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہِ دہلی اس ہنگام میں نہ صرف ملوث نہیں تھے بلکہ بے بس بھی تھے۔ فسادی بے مہار تھے۔ بادشاہ چونکہ ان فوجیوں کو بھگا سکنے پر قادر نہیں تھا اس لیے یہ فوجیں جمع ہوتی رہیں اور بادشاہ عاجز رہ گیا۔ باغیوں کا ظلم و ستم غالب کو ناجائز نظر آنے لگا اور دوسری طرف انگریز کی بربریت کا جواز بھی تلاش کر لیا۔ لکھتے ہیں:

> غضب ناک شیروں نے جب سے شہر میں قدم رکھا ہے۔ بے نواؤں کے قتل اور آتش زنی کو (اپنے لیے) روا کر لیا ہے، ہاں جو علاقہ بزور جنگ لیا جائے وہاں کے لوگوں پر اسی طرح زندگی تنگ کر دی جاتی ہے۔ اس کھلم کھلا قہر و غضب اور بغض و خصومت کو دیکھ کر خوف سے سب کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ (۶)

غالب کی اُمیدوں پر غدر نے پانی پھیر دیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۸۵۵ء میں غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لندن بھجوایا تھا۔ قصیدہ پہنچنے کی رسید بھی موصول ہو گئی تھی۔ رنگٹن بہادر نے خط بھی لکھا کہ قصیدہ گورنر ہند کی وساطت سے بھیجو۔ پھر غالب نے لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔ گورنر جنرل کا جواب اُمید افزا تھا کہ سفارشات کے ساتھ قصیدہ انگلستان بھجوا دیا گیا ہے۔ اس خبر سے غالب کا دل فرطِ انبساط سے اتنا بالیدہ ہوا کہ جسم جامہ میں نہیں سماتا تھا۔ لیکن اِدھر غدر کی بنا پر غالب کی امید روشن کا چراغ گل ہو گیا۔ اُدھر سرکاری پنشن بند ہو گئی۔ غالب کے لیے یہ ایک قسم کا صدمہ جانکاہ ثابت ہوا۔ اسی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں امن و انصاف کی بساط الٹ نہ گئی ہوتی اور خدا ناشناس اور ناسپاس سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں اجڑ نہ گئیں ہوتی تو گلستانِ انگلستان سے فرماں، انعام و اکرام کے پہنچتا اور میرے دیدہ و دل نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی ہوتی۔ (۷)

غالب نے انگریزوں کی جوابی کاروائی میں بھی انہیں ہی حق بجانب قرار دیا ہے کہ اب انگلستانیوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا انتقام لینے کے لیے لڑنے کو اٹھے اور مجرموں کو سزا دینے کے لیے لشکر آرائی کی تو شہریوں سے بھی بدظنی کے سبب محل اس کا تھا کہ غلبہ پانے کے بعد شہر دہلی میں کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے۔ انہوں نے ضبط کیا اور عورتوں اور بچوں کے جسم کا بال تک بیکا نہ کیا۔ آخر کتاب میں غالب نے اپنی اُن خواہشات کا ذکر بھی کر دیا ہے جن کی تکمیل کے لیے ''دستنبو'' تخلیق کی گئی۔ لکھتے ہیں :

> سال گذشتہ کے مئی کے مہینے سے جولائی ۱۸۵۷ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے اور یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش ان تینوں خواہشوں، خطاب، خلعت اور پنشن کے بارے میں، جن کی گذارش کا اس کتاب میں میں نے ذکر کیا ہے اور اب بدبینوں کی نظر بچا کر بڑی امیدوں سے دل ان کی طرف لگائے ہوئے ہوں، فیروز بخت، آفتاب افسر آسماں، تخت جمشید حشم، فریدون فر، کاؤس، سنجر کشاں، سکندر پایہ شہنشاہ کے حضور سے منظوری کا فرمان پہنچ جائے۔ (۸)

دستنبو کا غائر جائزہ لینے سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ یہ تصنیف غالب کا نثری قصیدہ ہے کیونکہ قصیدے کے جو اجزائے ترکیبی اور ترتیب ہوتی ہے، اسی انداز اور ترتیب کو بصورت نثر پیش کیا ہے۔ دستنبو میں غالب شاید مزید کچھ اضافے بھی کرتے لیکن ان کو اس امر کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ کسی وسیلے سے دستنبو کی اشاعت کی سبیل نکلے تاکہ جلد از جلد حکام کی نظروں سے گزار سکوں۔ اس طرح غالب اپنی وفاداری بشرط استواری کا جواز حکام کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔

اس ضمن میں مالک رام لکھتے ہیں:

> میرزا جو کچھ لکھتے جاتے، ساتھ کے ساتھ اس کی نقل میر مہدی مجروح کو بھی بھیج دیتے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی اور زیادہ لکھتے لیکن منشی اُمید سنگھ اندور

> والے ان کی ملاقات کو آئے تو انہوں نے دستنبو کا مسودہ دیکھ کر اسے چھاپنے کا قصد کیا۔اس لیے میرزا نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کے حالات لکھ کر کتاب ختم کر دی۔(۹)

دستنبو کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں مطبع مفید خلائق سے چھپ کر بازار میں آیا۔اسی دوران منشی شیونرائن نے ''مہر نیم روز'' کو دوبارہ چھاپنے کی خواہش ظاہر کی لیکن غالب نے انہیں لکھا کہ اب ''یہ کتاب چھپانے کے لائق ہے، نہ کہ چھپوانے کے۔'' مہر نیم روز خاندان تیموریہ کی تاریخ تھی اور غدر کے بعد یہ خاندان انگریزوں کا معتوب تھا۔لہٰذا غالب اس قسم کا خطرہ مول لینے پر ہرگز تیار نہ تھے کہ انگریز حکام اسے بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے۔دستنبو کی اشاعت میں غالب کی معاشی غرض و غایت مضمر تھی۔انہیں امید تھی کہ اس طرح ان کا دربار، خلعت اور پنشن بحال ہو جائے گی۔اس حوالے سے غالب منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور مَیں نے اس (دستنبو) کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔(۱۰)

دستنبو کی اشاعت کے دوران غالب نے کئی خطوں میں ہرگوپال تفتہ اور منشی شیو نارائن آرام کو کتاب کی خوب صورتی اور اسے جاذب نظر بنانے کی تجاویز دی ہیں۔مثلاً تفتہ کو لکھتے ہیں:

> اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔اس کی روش دلاویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔(۱۱)

غالب دستنبو کی چھ جلدوں کو انگریز حکام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ان جلدوں کی آراستگی کے لیے بہت بے چین تھے۔تفتہ کے نام خط میں اپنی بے چینی اور بے قراری کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں:

> کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی (بھائی سے مراد منشی نبی بخش حقیر ہیں) کا ہو گیا

ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبدالطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیوں کر کیا چاہیے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تا کہ حرف روشن ہو جائیں۔ سایہ قلم سے جدول بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری اُن کی، میرے کس دن کام آئے گی؟............ قصہ مختصر، یہ عبارت منشی عبد الطیف کو پڑھا دو، میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ (۱۲)

اشاعت کے وقت غالب کو کاغذ کی فکر لاحق تھی۔ چاہتے تھے کہ کتاب عمدہ کاغذ پر چھپے۔ خاص طور پر ان چھ جلدوں کے کاغذ کے لیے فکر مند تھے جو حکام کی نذر کرنی تھیں۔ اس ضمن میں ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنچ کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی جا ہو شیو رام پوری پر اور جا ہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانی والی ہیں، وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں............ اگر ہو سکے تو کاپی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ (۱۳)

کاغذ کے بعد غالب کو کتاب کی جلد کی فکر لاحق ہوئی۔ حاتم علی مہر کو ایک خط میں اس حوالے سے تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور ہاں حضرت، کچھ ایسی چنگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ (۱۴)

مذکورہ خط غالب نے ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا۔ اس دوران غالب کو سات جلدوں کا

پارسل موصول ہوگیا۔ اس ضمن میں ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:

> کل جو جمعہ روز مبارک وسعید تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے، نامہ فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام ہسات جلدوں کا پارسل پہنچا، واہ کیا خوب برمحل پہنچا آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو بر آتی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا، میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہاں تم جہاں میں رہو۔ (۱۵)

غالباً منشی شیو نارائن آرام نے دستنبو کے مسودہ کا کچھ حصہ کسی انگریز حکام کو پڑھ کر سنایا۔ اس نے پسند کیا۔ آرام نے خط میں غالب کو اس بابت لکھا۔ غالب کی بے چینی بڑھی اور منشی شیو نارائن آرام کو لکھا:

> یہ جو تم نے لکھا کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا۔ کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے، اس کی جو حقیقت ہو، مفصل لکھو۔ (۱۶)

غالب نے کتاب کی جلدیں مختلف انگریز حکام کو بھجوائیں۔ ان میں ایک نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ کو بھیجی تھی۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے غالب کو جوابی خط ارسال کیا۔ غالب ان جوابی خطوط پر بہت خوش ہوئے۔

ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

> مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زندگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب گورنر بہادر کی نذر، اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک

> آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القابِ قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات، کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا...... اور یہ بھی توقع پڑے ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ (۱۷)

''دستنبو'' کے چھپوانے میں بھی اسی غرض سے عجلت کی گئی تھی کہ اس کے ذریعہ سے حکام کے ساتھ تجدید روابط کی مناسب صورت پیدا ہو سکے۔ غالب نے اس کتاب کے نسخے جا بجا حکام کو بھیجے اور جب کہیں سے رسید آتی تو پھولے نہ سماتے اور اگر کسی کی طرف سے اطلاع نہ ملتی تو پژمردہ ہو جاتے تھے۔ غالب کے دوست بے خبر نے لیفٹیننٹ گورنر کے نام پارسل پہنچنے کی اطلاع بھیجی تو اس پر خوش ہو کر لکھا کہ اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے۔

مذکورہ بالا تمام شواہد خود غالب کے تحریر کردہ ہیں۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ غالب نے دستنبو کو اپنے مقاصد کے حصول اور انگریز حکام کی خوشنودی طلب کرنے کے لیے لکھا۔ غلام رسول مہر سے اس ضمن میں سہو ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس (دستنبو) کی تسوید شروع ہوئی تھی۔ تو غالب یا کسی دوسرے شخص کو یقین نہ تھا کہ انگریز ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ رسالہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے لکھا گیا تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے، بعض حالات کو مصلحتاً نظر انداز کر دیا ہو۔ (۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ غالب انگریزوں کے نمک خوار اور پنشن خوار تھے۔ دوسری طرف غالب کا ذہنی میلان آئینِ نو کی طرف تھا نہ کہ تقویمِ پارینہ کی طرف۔ اس کا اظہار انہوں نے بہت عرصہ پہلے سرسید احمد خاں کی ''آئینِ اکبری'' کی تقریظ میں یہ کہہ کر دیا تھا کہ ''مردہ پروردن مبارک کار نیست''۔ اسی طرح غالب بہت پہلے یہ بھانپ چکے تھے کہ خاندانِ تیموریہ کا چراغ اب آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام:

> حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کی ذاتی دل بستگی اور بہادر شاہی دربار سے ان کے خاندانی تعلقات کبھی بھی اتنے گہرے نہیں ہوئے کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے...... مرزا کی جاگیر حکومت انگلشیہ کا عطیہ تھی اور مرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ کئی انگریزوں کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔(۱۹)

جیسا کہ راقم نے گزشتہ سطور میں لکھا ہے کہ "دستنبو" ایک نثری قصیدہ ہے۔اور اس کا عنوان ہی اس کا مسلم ثبوت بھی ہے۔دستنبو کے معنی "گل دستے" اور "عطر دان" کے ہیں۔گل دستے عموماً مبارک باد اور تہنیت کے موقعوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔غالب نے بھی یہ نثری قصیدہ انگریز حکام کو فتح دہلی کے موقع پر پیش کیا۔ڈاکٹر نتالیا پری گارینا نے کتاب کے عنوان کے حوالے سے الگ رائے دی ہے۔وہ لکھتی ہیں:

> شاید اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷۔۱۸۵۹ء کی بغاوت اور اس کی ناکامی کی اس داستان کو، جو اُس زمانے کے واقعات کے روزنامچے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے، "دستنبو" کا نام دے کر غالب نے بڑے کڑوے طنز سے کام لیا ہے۔(۲۰)

دستنبو میں غدر کے دو مراحل سے متعلق اندرجات کا نمایاں عدم تناسب بھی پایا جاتا ہے۔پہلے چار مہینوں کو، جب دہلی میں باغیوں کا راج تھا، بہ درجہ ہا کم جگہ دی گئی ہے بہ نسبت بعد کے مہینوں کے، جب انگریز شہر میں داخل ہو کر باغیوں کے خلاف انتقامی کاروائی کر رہے تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر نتالیا پری گارینا لکھتی ہیں:

> بہ حیثیت مجموعی تصنیف کے آہنگ یعنی "باغیوں" اور "شورہ پشتوں" کی مذمت، انگریزوں کی "شرافت نفس" اور ان کے مشن کی واجبیت کے اعتراف کی وضاحت بھی اس صورت حال سے ہوتی ہے۔اس تصور کے مطابق "دستنبو" (یعنی گل دستے یا عطر دان) کا مقصد یہ تھا کہ فرماں رواؤں کے ہاتھوں میں پہنچ کر وہ ان کے مشام جاں کو معطر کرے اور بغاوت کے

> زمانے میں شاعر کی وفاداری کا ثبوت فراہم کرے، تاکہ وہ پنشن کی بحالی کی امید پھر سے باندھ سکے۔ غالب اس طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ نو آبادیاتی حکومت کی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آکر کچلے جانے سے خود کو بچا لیں لیکن ان کے اس گلدستۂ رنگ و بو سے خون اور جلا کر راکھ کر دی جانے والی بستیوں کی بو آتی ہے اور گھٹی ہوئی نثر کی عطر بیزیاں اس بو کو محض اور ناگوار بناتی ہیں۔(۲۱)

غالب نے اس انقلاب کو "رستخیز بے جا" کہا ہے۔ قومی نقطہ نظر سے یہ ایک تاریخی بد دیانتی بنتی ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو ۱۸۵۷ء کا غدر واقعی ہی ایک ایسی قیامت تھی جس کا حاصل کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا ایسی قیامت ڈھانا بے جا ہی تھا۔ اصل میں ہنگام غدر میں غالب مجبور تھے اور وہ اس انتظار میں تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ بقول انیس ناگی:

> غالب کا ۱۸۵۷ء کے بارے میں رویہ اس عہد کے ایک مصلحت پسند کا تھا جو بیک وقت انگریزوں اور انقلابیوں سے ڈرتا تھا اور کسی ایک کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔(۲۲)

اس تصنیف کے مقصد کے بارے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

> دستنبو لکھنے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلعت و خطاب اور پنشن کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف کے بیان پر مشتمل ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں جن کو انہوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔(۲۳)

فاروقی صاحب کے بیان کا پہلا حصہ بلا شبہ درست ہے لیکن دوسرا حصہ "ایک بڑا حصہ ان پر تکالیف کے بیان پر مشتمل ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں" درست نہیں۔ غالب نے صرف اپنے مسائل کو دبے لفظوں میں

بیان کیا ہے اور حکام کو اپنی بے چارگی کا احساس دلایا ہے۔ ہاں اس دور کے خطوط میں کھل کر اہلِ دہلی کے مصائب کو قلم بند کیا ہے۔ غدر کے بعد میاں داد خاں سیاح لکھتے ہیں:

> رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم، یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً برے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔ میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روشِ ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟
> ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے:
>
> اے دریغا نیست ممدوحِ سزا وارِ مدیح
> اے دریغا نیست معشوقِ سزا وارِ غزل (۴۴)

دستنبو کے بارے میں غالب کا دعویٰ تھا کہ یہ تصنیف خالصتاً پارسی میں ہے اور عربی کا کوئی لفظ اس میں شامل نہیں۔ اب یہ غالب کی انفرادیت تھی یا سیاسی چال کہ عربی الفاظ سے پاک گل دستہ حکام کو پیش کیا جایا۔ دستنبو میں ایک لفظ ''نہیب'' آ گیا۔ تفتہ کو کئی خطوط میں لکھا کہ اس لفظ کو چھلوا کر دوسرا لفظ ''بہ نوائے'' لکھا جائے۔ اب غالب کی بے چینی ملاحظہ ہو کہ وہی غالب جو روپے کے لیے ترستا تھا اب اس کی کوئی فکر نہیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

> اچھا میرا بھائی! ''نہیب'' والے دو ورقے چار سو ہوں، پانچ سو ہوں'' سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبا لگ جائے گا۔ (۴۵)

غالب نے دستنبو کے پہلے ایڈیشن کے شروع کے چھ صفحوں میں ملکہ معظمہ کی مدح میں قصیدہ ''شمار یافت، روزگار یافت'' شامل کیا اور اس کے بعد پھر صفحہ اوّل سے دستنبو کا آغاز کیا۔ یوں قصیدے کے ساتھ نثری قصیدہ دستنبو کی صورت میں پیش کیا۔ ۱۸۶۵ء میں غالب نے حکام کو ایک درخواست گزاری تھی کہ حکومت دستنبو کو اپنے خرچ پر شائع کرے۔ اس ضمن میں حکومت پنجاب نے ملاحظہ کے لیے کتاب کا نسخہ طلب بھی کیا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

حواشی

۱۔ شیخ محمد اکرام غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء ص ۱۲۸
۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب اور شاہان تیموریہ، اُردو اکیڈمی دہلی ۱۹۷۲ء ص ۹
۳۔ اسد اللہ خان غالب، دستنبو، (مترجم) محمود سعیدی، الکتاب کراچی، اگست ۱۹۶۹ء ص ۳۲،
۴۔ ایضاً ص ۴۳
۵۔ ایضاً ص ۴۸
۶۔ ایضاً ص ۶۵
۷۔ ایضاً ص ۷۹
۸۔ ایضاً ص ۱۱۸
۹۔ مالک رام، ذکر غالب، مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۹
۱۰۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد اول، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۸
۱۱۔ ایضاً ص ۲۸۸
۱۲۔ ایضاً ص ۲۸۹
۱۳۔ ایضاً ص ۲۹۲
۱۴۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد دوم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۷۱۷
۱۵۔ ایضاً ص ۷۱۲، ۷۱۳
۱۶۔ ایضاً ص ۱۰۵۲
۱۷۔ ایضاً ص ۵۰۸
۱۸۔ غلام رسول مہر، غالب، شیخ مبارک علی بک سیلر، لاہور، طبع چہارم، ۱۹۳۶ء، ص ۲۳۱
۱۹۔ شیخ محمد اکرام، ایم۔اے، حکیم فرزانہ۔ مرزا غالب کی نظم و نثر، شخصیت اور فلسفہ پر تفصیلی تبصرہ۔ فیروز

سنز لاہور ۱۹۵۷ء، ص۲۹۴
۲۰۔ ڈاکٹر نتالیا پری گارنیا، مرزا غالب (روسی سے ترجمہ) از محمد اسامہ فاروقی، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۳۲۰
۲۱۔ ایضاً، ص۳۲۷
۲۲۔ انیس ناگی، غالب پریشاں، مکتبہ جمالیات، لاہور ۱۹۹۳ء، ص۳۱
۲۳۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یادو بود غالب، ترقی اردو بیورو، نئی دلی، ۱۹۹۳ء، ص۱۳۷
۲۴۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد دوم بحوالہ بالا ۱۳، ص۶۰۳
۲۵۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد اول بحوالہ بالا ۱۰، ص۳۹۳

مشتاق احمد یوسفی: غالب کے مشتاق

مشتاق احمد یوسفی: غالب کے مشتاق

خاندانی حالات، علمی پس منظر اور وسیع مطالعہ ایسے بنیادی عناصر ہیں جو نہ صرف شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں بلکہ اس کے فن کو بھی نکھار بخشتے ہیں۔ بلا شبہ ان تمام امور کا اطلاق مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور فن پر ہوتا ہے۔ ناقدین نے ان کی شخصیت کو باغ و بہار بتایا ہے۔ باغ و بہار وہی شخصیت ہو سکتی ہے جو اپنے آپ سے اور زندگی سے کچھ حد تک آگاہ ہو چکی ہو۔ علم اور وسیع مطالعہ کی کھاد سے ہی شخصیت نکھرتی ہے، آگاہی کے عذاب سے دوچار ہوتی ہے اور اسی مزاج کا عکس اس کی زندگی اور تحریروں میں نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں سوانحی مواد کی فراہمی پر بات کرتے ہوئے صدیق جاوید لکھتے ہیں:

> ۔۔۔۔۔۔ دنیا کا ہر بڑا شاعر اور فلسفی مطالعہ کی دولت سے امیر ہوا، ملٹن، گوئٹے، ورڈزورتھ، کالرج، ٹی ایس ایلیٹ، فیضی، بیدل، خیام، امیر خسرو اور غالب وغیرہ کے سوانح اس امر کے شاید ہیں۔(۱)

یوں دیکھا جائے تو مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں غالب کے فن کا اثر نظر آتا ہے اور مطالعہ غالب کی بنا پر ان کی تحریروں میں نکھار آ گیا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے کہا تھا کہ:

> آپ مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کو ضرور پڑھتے ہوں گے۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مرحوم نے فرمایا "اگر رشید احمد صدیقی کی کمزوریوں کو ان کی خوبیوں میں سے گھٹا دیں تو حاصل تفریق مشتاق احمد یوسفی رہیں گے(۲)

راقم کی رائے میں اگر نظیر صدیقی کے مذکورہ بالا بیان کو اسما کی تبدیلی کر کے یوں پڑھا

جائے تو زیادہ موزوں رہے گا کہ آپ نے مشتاق احمد یوسفی کے مضامین تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مرحوم نے فرمایا" اگر رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی خوبیوں کو جمع کیا جائے تو حاصل جمع غالب رہیں گے۔ مطلب یہ کہ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کے ہاں غالب کے فکروفن کے اثرات پائے جاتے ہیں۔عام طور پر ہر ممتاز ادیب یا شاعر کو پڑھتے وقت اس کی انفرادیت کے باوجود کئی ادیب یا شاعر ایسے ذہن میں آتے ہیں جو اس کی تخلیقات میں جلی یا خفی اثرات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اسی طرح مشتاق احمد یوسفی کا مطالعہ کرتے وقت غالب ضرور یاد آتے ہیں اور قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے فن میں غالبیات رچی بسی ہوئی ہے۔ہاں یہ درست ہے کہ غالب کے اثرات پہلے (تقدم زمانی کے اعتبار سے) رشید احمد صدیقی کے فن پر اور بعد میں غالب اور رشید احمد صدیقی دونوں کے اثرات مشتاق احمد یوسفی کی تخلیقات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔یوں اثرات کے حوالے سے ان کی مثلث بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اردو ادب میں غالب ایسی عبقری شخصیت ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو شاعری ہی کو اوج کمال اور نئی جہتیں عطا کیں بلکہ اُردو نثر کے لیے بھی لفظیات کا ایسا گنجینۂ وافر چھوڑ گئے ہیں کہ آنے والے نثر نگاروں نے اپنے گلستان نثر کی آراستگی کے لیے اسی چمنِ غالب سے گل چینی کی۔یوں تو اردو کے بھی نثر نگاروں کے ہاں غالب کے اثرات جلی یا خفی پائے جاتے ہیں لیکن اس خصوص میں مشتاق احمد یوسفی سرفہرست ہیں۔مشتاق احمد یوسفی نے غالب کا بالا استیعاب مطالعہ کیا ہے جو ان کی خوب صورت نثر میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اردو اسالیب نثر کے ارتقا میں غالب ایک مجتہد اور نابغہ روزگار ہستی ہیں۔

بقول طارق سعید:

یہ غالب ہی ہے جس نے بیانیہ اسلوب،توضیحی اسلوب، اثباتی اسلوب، تاثراتی وشگفتہ اسلوب،طنزیہ اور ظرافت آمیز اسلوب، خطیبانہ اسلوب،

> بنیادی اسلوب اور احتجاجی اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے، پر دان چڑھا کر ان کی آب یاری اپنے خون جگر سے کی اور باغ اردو میں ان کے جاوداں پھول کھلائے (۳)

غالب کا اسلوب نثر ایسا ہشت پہلو اور اپنے اندر ایسی بوقلمونی سموئے ہوئے ہے کہ اس سے اردو کا کوئی نثر نگار اپنا دامن بچا کر شہرت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔ غالب کے اثرات ہر باشعور ادیب پر شعوری اور لاشعوری دونوں طور پر موجود ہیں۔ بقول طارق سعید:

> اسالیب نثر اردو کے ارتقاء میں غالب کا حصہ سب سے اہم ہے اور ریاضی کے حساب کے مطابق غالب ۷۰٪ فی صد اسالیب کا موجد یا امام ہے۔ بقیہ ۳۰٪ فیصد میں تمام دوسرے مجتہد فنکار شامل ہیں۔ (۴)

یہاں ایک اور امر واضح کرتا جاؤں کہ اردو نثر نگاروں کا غالب سے متاثر ہونا عیب نہیں، ہنر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اپنے فکر کی پیش کش کے لیے لفظوں کے انتخاب کو اس درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے کہ تا حال اس پر اضافہ ممکن نہیں یا تاوقتیکہ کسی نئے عندلیب گلشن نا آفریدہ کی آمد نہ ہو۔ کیونکہ غالب کا فکر و فن انسانی فطرت اور معاشرتی رویوں کا بہترین عکاس ہے اور الفاظ و تراکیب کا استعمال اس پر مستزاد۔ اسی حوالے سے غالب کے خطوط پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں:

> ہماری مزاح نگاری کے کتنے شیوہ ہائے رنگا رنگ ان خطوں سے ابھرے۔ رشید احمد صدیقی سے مشتاق احمد یوسفی تک ذکاوت (Wit) سے کام لینے والے ادیبوں کے ہاں ان خطوں کے کیا اثرات کارفرما ہیں۔ (۵)

اردو کا کوئی بھی باشعور فن کار کبھی بھی غالب کے اثرات سے پہلوتہی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس حوالے سے اردو نثر میں رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے غالب سے ذہنی روابط کچھ زیادہ ہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> غالب کی تخلیقی کٹھالی سے کوئی مرکب بن کر نکلتا ہے تو اسے نئے معنی ہی

> نہیں ملتے بلکہ اسے زندگی کا تحرک بھی مل جاتا ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ "میر اور مومن بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انہیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لیے بنے ہیں۔"(۶)

غالب سے یوسفی کی محبت اور ذہنی روابط کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی چاروں تخلیقات کے اکثر ذیلی عنوانات بھی غالب کے اشعار کے مصرعوں سے اخذ کیے ہیں۔دوسرے یہ کہ اپنی پہلی کتاب "چراغ تلے" سے لے کر آخری کتاب "آب گم" تک پہنچتے پہنچتے یہ رنگ بہت چوکھا ہو گیا ہے۔اس ضمن میں مشتاق احمد یوسفی نے غالب کے آثار نظم ونثر کو ہر زاویے سے استعمال کیا ہے۔غالب کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثر (خطوط غالب) کو بھی موقع ومحل کے مطابق استعمال کیا ہے۔کہیں خطوط کے اقتباسات من وعن دیے ہیں۔کہیں غالب کی مخصوص لفظیات کو استعمال کیا ہے، جس طرح منٹو اور فیض نے غالب کی لفظیات اور تراکیب کو اپنی تخلیقات میں برتا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> یہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ منٹو ہوں یا فیض ان سب نے اپنے عنوانات، موضوعات اور تراکیب تک میں غالب کے چراغ سے چراغ جلائے ہیں۔"(۷)

اس ضمن میں یوسفی نے مزاح کے معروف حربے "تحریف" سے زیادہ کام لیا ہے اور غالب کے اکثر اشعار اور مصرعوں کو تحریف کے حربے کے ذریعے استعمال کر کے اپنی تحریر کو چار چاند لگائے ہیں۔اس میں لطف یہ کہ قاری ایک طرف غالب کے اشعار سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے جو مضمون اور موضوع کے سیاق وسباق کے حوالے سے انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف ان اشعار میں اپنی تیکھی اور چبھتی ہوئی تحریف نگاری کے ذریعے قاری کو اچانک حیرت ناک وہیبت ناک مزاح کی ترنگ کا سامان بھی مہیا کر دیتا

ہے۔ اسی لیے پروفیسر کلیم الدین احمد کو کہنا پڑا کہ:

> اگر اُردو انشا پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کرسکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنہیں فنا نہ ہو تو پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعے میں صرف کریں۔(۸)

مشتاق احمد یوسفی نے طنز و مزاح کے حربوں میں جس حربے کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے وہ تحریف نگاری ہے۔ پیروڈی یا تحریف کی اہم شرط یہ ہے کہ یہ کسی معروف بیان، تحریر یا فن پارے کی ہو اور ایسے سلیقے سے کی جائے کہ خود بھی فن پارہ بن جائے۔

بقول ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:

> جس تحریر کی تحریف کی جائے، اس کا زبان زدِ عام ہونا ضروری ہے تا کہ دونوں عبارتوں اور ان کے مفاہیم کے فرق کو سمجھ کر حظ اٹھایا جا سکے۔(۹)

غالب کا تخلیقی سرمایہ بھی زبان زدِ عام ہے اسی لیے یوسفی نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس سرمائے کو اپنی تخلیقات میں خوب برتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

> تحریف کا قیمتی عنصر اس کی اپنی ہیئت ہے، جتنی کامیاب اس کی ہیئت ہوگی اور جتنی کامیابی سے یہ اصل اور نقل میں ہم آہنگی اور تضاد کو نمایاں کر سکے گی۔ اتنا ہی یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگی(۱۰)

یوں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی تحریر میں زبان و بیان کا جو حسن ہے اس کو دوبالا کرنے میں غالب کے فکر و فن نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ذیل میں مشتاق احمد یوسفی کی چاروں تخلیقات کی تاریخی ترتیب کے حوالے سے غالب سے ذہنی روابط کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی کتاب چراغ تلے(۱۱) سے مثالیں جن کی تعداد میں (۳۰) ہے، پیش خدمت ہیں۔

سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے۔ ص ۱۰

تصانیف: چند تصویر بتاں ، چند مضامین و خطوط۔ ص ۱۲

میری رائے میں جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا۔ ص ۱۴

"پڑیے گر بیمار" (مضمون) تو کوئی نہ ہو تیماردار؟۔۔۔۔ مر جائیے تو نوحہ

خواں کوئی نہ ہو۔ ص ۱۶

غالب کے طرف دار یہ کہیں کہ۔۔۔۔ درد لا دوا کی لذت۔

ص ۱۶، ۱۷

"تقریب بہر ملاقات" کے سوا کچھ نہ تھی۔ ص ۱۸

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ ص ۱۸

اگر اس غزل میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ ص ۱۹

قوت برداشت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ ص ۳۹

چمار کا صنم کدہ ویراں کیے ابھی تین ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ۔ ص ۷۰

جو تم نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتا۔

ص ۷۳

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال۔ ص ۷۴

ہم داد کے خواہاں ہیں نہ انصاف کے طالب۔ ص ۸۱

جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلیں۔ ص ۸۱

تلخی کام و دہن۔ ص ۸۳

اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ وارد ان بساط مطبخ اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ ص ۸۸

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے! ص ۹۰

چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقش فریادی کو سینے سے چمٹائے میرے پاس

آئے۔ ص ۹۹

چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردۂ ساز اور نہ اپنی شکست کی آواز۔ ص ۱۰۳

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے۔ ص ۱۰۵

کرکٹ دراصل انگریزوں کا کھیل ہے اور کچھ انہی کے بلغمی مزاج سے لگا کھاتا ہے۔ ص ۱۱۶

غالب نے شاید ایسی ہی کسی صورت حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ ص ۱۱۷

بات کرنے پر دشمنوں کی زبان کٹتی ہے۔ ص ۱۳۲

شام کو عموماً اتنی اوس پڑتی ہے کہ آپ اوک سے پانی پی سکتے ہیں۔ ص ۱۵۰

مرزا غالب کے قویٰ مضمحل ہوئے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تن درستی نام ہے عناصر میں اعتدال کا! ص ۱۵۱

کاغذی ہے پیرہن (مضمون) ص ۱۵۶

آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو! ص ۱۵۶

وہ اک دہن کہ بظاہر دہانے سے کم ہے۔ ص ۱۵۹

عید نظارہ ہے تصویر کا عریاں ہونا ص ۱۶۳

زوال آدم سے لے کر اس وقت تک واماندگی شوق یہ پناہیں تراشتی رہی ہے۔ ص ۱۶۴

اب ذیل میں دوسری کتاب 'خاکم بدہن' میں شامل غالبیات کے عناصر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ (۱۲) جن کی تعداد بائیس (۲۲) ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد (دیباچہ) ص ۷

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا (دیباچہ) ص ۹

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانوں (دیباچہ) ص ۱۲

چنانچہ جگر لخت لخت کو پھر جمع کیا (دیباچہ) ص ۱۵

کتابیں رکھنے کے گناہ گار ضرور تھے۔ طوعاً و کرہاً بیچ بھی لیتے تھے۔ لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر۔ ص ۲۷

اگر اس وقت ہمارے ذم ہوتی تو ایسی ہلتی کہ پھر نہ تھمتی۔ ص ۴۴

(کتا) جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ گھگھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکالے جاتے۔ ص ۵۶

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا ص ۷۷

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ص ۸۷

ہوئے مر کے ہم جو رسوا (مضمون) ص ۱۱۷

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی اور دن؟ ص ۱۴۲

چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے ص ۱۵۴

صاحب! جلوہ گری میں کوئٹہ سے کم نہیں

وہی نقشہ ہے ولے! اس قدر آباد نہیں" ص ۱۶۱

تمام رات ہماری یہ ڈبری ڈیوٹی رہی کہ دام شنیدن بچھائے بیٹھے رہیں۔

ص ۱۶۹

وہ اِک گرہ جو بظاہر گناہ سے کم ہے۔ ص ۱۷۶

آبرو ہے شیوہ اہل نظر گئی ص ۱۷۸

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے ص ۱۷۸

مرزا کا ذکر ،اور پھر بیاں اپنا ص ۱۸۶

چند تصویر بتاں (مضمون) ص ۱۸۹

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی ص ۱۹۴

وہ جاتی تھی کہ ہم نکلے ص ۱۹۹

اسداللہ خاں قیامت ہے! ص ۲۱۴

تیری کتاب "زرگزشت" میں خاکم بدہن کی نسبت غالبیاتی عنصر زیادہ ہے (۱۳) جن کی تعداد اٹھائیس (۲۸) ہے۔

بگڑے جاتے ہیں بزرگوں کے کیے پر ناحق ص ۱۲

شہروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے ص ۱۲

حُسن خود بین و خود آرا جب ۳۳ نمبر کے مشمولات کا ۳۴ نمبر کے سوئٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سرخی رخساروں پر دوڑ جاتی ہے۔ ص ۱۹

یہ موقع اس کے دامن کو ظریفانہ کھینچنے کا نہیں تھا ص ۲۷

ہم نے تا دم تقریر و تقرر ص ۲۷

بقول غالب، پیشہ میں عیب نہیں۔ ص ۳۹

پر طبیعت ادھر نہیں آتی ص ۵۰

ایک تیر تُو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے۔ ص۵۶

یہاں ان کے طرۂ پیچ وخم کے سارے پیچ وخم ایک ایک کر کے نکالے جاتے۔ ص۶۸

نشاط سے کس روسیاہ کو غرض تھی ص۶۹

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ص۷۶

قیس تو قیس لیلیٰ بھی تصویر کے پردے میں سے عریاں نکلتی ص۷۶

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے! ص۱۱۷

گو دانت کو جنبش نہیں ---- ص۱۳۵

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں ص۱۳۵

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ گھر بگڑے ص۱۴۰

ناکردہ گناہوں کی اس ناگفتنی فہرست ص۱۴۰

رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری، ہائے ہائے ص۱۴۰

ہم بیٹھے انتظار ساغر کھینچتے رہے ص۱۴۱

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے ص۱۶۰

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو (عنوان) ص۱۷۹

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا (عنوان) ص۱۷۹

سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا ص۲۰۷

واقعہ سخت تھا پر اہل و عیال کی جان بھی عزیز تھی ص۲۲۳

ہے خبر گرم ان کے جانے کی ص۲۳۶

مجموعۂ اغلاط ہے دنیا مرے آگے ص۲۵۳

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا ص۲۵۷

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے۔ وہ کافر تھا، گنہگار نہیں ص۲۶۰

اب آخر میں "آبِ گم" (۱۴) سے مثالیں جو نہ صرف مشتاق احمد یوسفی کی شاہکار تصنیف ہے بلکہ اس میں غالبیاتی عنصر دیگر سبھی تصانیف سے زیادہ ہے اور اس کی تعداد ۶۷

ہے۔ ''آب گم'' کا پہلا حصہ ''حویلی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں جو کردار تخلیق کیا گیا ہے اس کا نام ''قبلہ'' ہے۔ اس کردار کے سوانح غالب کے سوانح سے ناقابل یقین حد تک ملتے ہیں۔ غالب کی طرح قبلہ بھی اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے ہیں، سپاہی بچہ ہونے پر ناز ہے، مزاج کی کیفیت، ایام اسیری کی روداد، جوئیں پڑنا، بیماری اور موت کے متعلق پیش گوئیاں وغیرہ، قبلہ کے ایسے حالات ہیں جو حالات غالب کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی انا ہے۔ قبلہ میں بھی بلا کی ضد اور انا پائی جاتی ہے۔ گویا الگ بات ہے کہ غالب عیار طبع خریدار دیکھ کر اپنی انا میں لچک بھی پیدا کر لیا کرتے تھے۔ اب مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے ص ۱۵
کچھ اندیشہ ہائے دور دراز بھی ستانے لگے ص ۱۹
میرے ہم پیشہ وہم مشرب و ہم راز یہ نہ سمجھیں ص ۱۹
شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے۔
ص ۲۰
یہ شاد عا ہے، نہ اختصار مختصر گزارش احوال واقعی ہے۔ ص ۲۲
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد ص ۲۷
سیر بھر اصلی گھی ص ۴۴
بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو ص ۴۵
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ص ۴۵
ننگ خلائق، ننگ اسلاف ص ۵۱
ماوراء النہری اور خیبر کے اس پار سے ص ۵۲
جانگسل ص ۵۳
ہوں لائق تقریر پہ الزام غلط ہے ص ۵۷
میں سپاہی بچہ ہوں۔۔۔۔

دوکان داری میرے لیے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ ص ۶۰

ایام اسیری اور جوں کا "بلڈ ٹمیسٹ" ص ۶۰

کو کبھی جیل نہیں کہتا۔ زنداں کہتا ہے ص ۶۴

"منفعل" ہو گئے قوی غالب اب عناصر میں "ابتذال" کہاں ص ۷۰

واماندگی و وزیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں ص ۷۰

گویا البم کھل گیا ص ۷۰

مردم ناشناس ص ۷۰

بی بی مصلے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا میں ہی جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ ص ۷۴

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز ص ۸۳

خواب نیم روز ص ۸۴

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ص ۸۷

جو اس عالم آب و گل میں بآسانی دستیاب ص ۸۷

جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں ص ۹۰

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ص ۹۰

برمحل تضحیک ص ۹۳

دم واپسیں لبوں پر مسکراہٹ ص ۹۳

مے سرد افگن ص ۹۷

انگلیں کے بحکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس ص ۱۱۳

عالم تمام حلقہء دام عیاں ہے ص ۱۱۷

جیسے ہی گھوڑا آرہا ہے! کا غلغلہ بلند ہوتا تو جس کو دین و دل یا کچھ اور بھی عزیز ہوتا راستہ چھوڑ کر

تماشا دیکھنے دور کھڑا ہو جاتا۔ ص ۱۲۳

اچانک تمیز کی یاد آئے تو گھوڑے کو اسپ، گویے کو رامش گر اور خود کو روسیاہ کہنے لگتا۔ ص ۱۳۵

کچھ اور چاہیے وسعت مرے میاں کے لیے ص ۱۳۵

ہر سال یکم جنوری کو اپنا قطعہ تاریخ وفات کہہ کر رکھ لیتے جو بارہ تیرہ سال سے شرمندہ تعبیر ہونے

سے محروم تھا۔ ص ۱۳۶

تاہم حق مغفرت کرے

عجب پاچہ محاورہ و روزمرہ مرد تھا ص۱۳۷

اپنی جوانی کا ذکر آتے ہی تڑپ اٹھتے "اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے" ص۱۳۸

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ص۱۵۱

انتظار صید میں اک دیدہ بے خواب تھا ص۱۶۷

کر بنے دوست ناصح (عنوان)

ص۱۶۷

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ص ۱۷۶

۔۔۔قصور اپنا نکل آیا ص۱۷۷

اس قطع تعلق کے باوجود، اسے کم از کم حجامت کے لیے آنے کی تو اجازت دی جائے۔ ص۱۹۳

اندیشہ ہائے فریب ص۱۹۶

کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی ص۲۰۵

نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی ص۲۱۵

مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا جس کا روز اور شب ماہتاب میں خون کرتے تھے۔ ص۲۱۵

زیست مہمل ہے اسے اور بھی مہمل نہ بنا ص۲۱۵

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے سر پہ ہے ص۲۱۹

اک عمر سے ہوں لذت نسیاں سے بھی محروم ص۲۳۹

کمروں کی تعمیر میں خرابی کی ایک سے زیادہ صورتیں مضمر تھیں۔ ص۲۴۲

خواب نیم روز ص۲۶۱

کون بھڑوا کہتا ہے کہ بشیر لاولد ہے۔ ص۲۹۳

پھر انہوں نے دوڑ دوڑ کر اپنا دفتر لخت لخت اس طرح جمع کیا جس طرح لونڈے پتنگ لوٹتے ہیں۔ ص۳۰۰

نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں "مزار" ہوتا ص۳۰۳

وہ اک پیہ جو بظاہر سپاہ سے کم ہے ص۳۰۶

غالب کی خواہش کہ "گلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھرو کہ میں۔۔۔۔۔غالب نے کیسی ظالم بات

کہی ہے ۔ حیف کافر مُردن و آوخ مسلمان زیستن ۔ یعنی پروردگار! مجھے کافروں کی طرح مرنے اور مسلمانوں کی طرح جینے سے بچا۔ سب کچھ سات لفظوں کے ایک مصرع میں سمو دیا۔ ص ۳۱۰

شعرا بطور استعارہ یعنی ناکردہ وصل کی حسرت کے الزام میں خود کو معشوق کے ہاتھوں قتل کروانے کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔ ص ۳۱۲

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟ ص ۳۲۲

عیش و غم در دل نمی استد خوشا آزادگی   بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما

(غالب کہتا ہے، عیش اور غم دونوں ہمارے دل میں نہیں ٹھہر پاتے ۔ ہماری آزادروشی کے کیا کہنے ۔ ہماری چھلنی کے لیے شراب اور خون دونوں برابر ہیں یعنی دونوں چھن کر نکل جاتے ہیں۔ ص ۳۲۶

بیدلی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ص ۳۲۶

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ   داورا! نمی زیبد بال و پر بمن تنہا

یعنی میرے سب رفیق اور سب ہمدم پر شکستہ اور دل تنگ ہیں ۔ اے خدائے عادل! مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تنہا میرے ہی بال و پر ہوتے ۔ ص ۳۲۷

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک ص ۳۳۰

پر طبیعت ادھر نہیں آتی ص ۳۳۲

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ص ۳۳۶

خس خانہ و برفاب ص ۳۵۵

گنجینۂ معنی کا طلسم دکھاتا ہوں ص ۳۶۰

جس کو ہو دین و دل عزیز میرے گلے میں آئے کیوں ص ۳۶۱

اب ایسے استاد کہاں سے لائیں ص ۳۶۳

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے ص ۳۸۵

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہاں میں غالب
جو جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

ص ۳۸۸

خود بین و خود آرا خواتین ص ۳۹۱

تیرے کوچے سے ہم۔ نکلے ص۳۹۶

سگ مردم گزیدہ ص۴۰۲

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ ''یہ بے ننگ و نام ہے''! ص۴۰۳

مذکورہ بالا مثالوں سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے فن میں ''غالبیات'' کس حد تک رچا بسا ہوا ہے۔ یوسفی نے اپنی اولیں تخلیق ''چراغ تلے'' میں اپنی پسند کے بارے میں برملا کہا ہے کہ میری پسند ''غالب، ہاکس بے اور بھنڈی'' ہے۔ ظاہر ہے پسندیدہ شخصیت کے اثرات بھی پسند کرنے والے دل و دماغ پر بھی مرتسم ہوتے ہیں۔ مزاح کے حربوں میں تحریف نگاری ایسا ہتھیار ہے جس میں جمع خرچ تو دوسروں کا ہوتا ہے لیکن تحریف نگار اپنی ہنرمندی سے جلا اپنے فن کو بخشتا ہے۔ اس ضمن میں یقیناً مشتاق احمد یوسفی ایک کامیاب ترین تحریف نگار ٹھہرتے ہیں۔

حواشی

۱۔ صدیق جاوید، اقبال کی مذکور کتابیں، مشمولہ ماہنامہ "کتاب" لاہور، اقبال نمبر، شمارہ نومبر۱۹۷۳ء ص ۳۷
۲۔ نظیر صدیقی، میرے خیال میں، بزم اردو مشرقی پاکستان، ڈھاکا، ۱۹۶۸ء، ص ۳۶۵
۳۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۳۸۱
۴۔ ایضاً ص ۳۸۳
۵۔ سہیل احمد خاں، مجموعہ سہیل احمد خاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵۹،۶۰
۶۔ انور سدید، غالب کا جہاں اور، کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۸۶ء، ص ۴۱
۷۔ پروفیسر محمد حسن، "غالب صدیوں کے آئینے میں" مشمولہ جہات غالب (مرتب) ڈاکٹر عقیل احمد، شاہد پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن ص ۱۳
۸۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، اردو ادب میں طنز و ظرافت، مشمولہ، "نقوش" طنز و مزاح نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۸ء ص۔ ۶۳
۹۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۳ء ص۔ ۳۰
۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا "پطرس کی تحریف نگاری، مشمولہ "نقوش" ۔ پطرس نمبر، مئی ۱۹۵۹ء ص ۱۵۸
۱۱۔ مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعت چودھویں بار
۱۲۔ ــــــــــ خاکم بدہن، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعت چودھویں بار، ۲۰۰۰ء
۱۳۔ ــــــــــ زرگزشت، جہانگیر بکس، لاہور، س۔ن۔
۱۴۔ ــــــــــ آب گم، جہانگیر بکس، لاہور، س۔ن۔

فیض کی غالب سے شاعرانہ مماثلتیں

فیض کی غالب سے شاعرانہ مماثلتیں

غالب اور فیض کے پرستار ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے اپنی تصنیف ''غالب آشفتہ نوا'' کو فیض کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمارے دور کے شعرا میں غالب سے فیض کا تعلق خاطر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ادب میں غالب ایسی عبقری شخصیت ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو اوج کمال عطا کیا اور لفظیات کا ایسا گنجینۂ وافر چھوڑا کہ آنے والے شعرا نے اپنے گلستان شاعری کی آراستگی کے لیے اسی چمن غالب سے گل چینی کی۔ اردو شعرا کا غالب سے متاثر ہونا عیب نہیں، ہنر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اپنے فکروفن کی پیش کش کے لیے لفظوں کے انتخاب کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے کہ اس پر اضافہ ممکن نہیں اور تراکیب کا استعمال اس پر مستزاد۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> غالب کی تخلیقی کٹھالی سے کوئی مرکب بن کر نکلتا ہے تو اسے نئے معنی ہی نہیں ملتے بلکہ اسے زندگی کا تحرک بھی مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ ''میر اور مومن بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انہیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لیے بنے ہیں۔ (۱)

اردو شعرا میں فیض، غالب اور اقبال سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور اسلوب کے اعتبار سے میر کے قریب ہیں۔ فیض نے غالب سے زیادہ کسب فیض کیا ہے۔ فکری طور پر وہ غالب سے اتنے متاثر ہیں کہ اپنی شاعری کے بیشتر مجموعوں اور کلیات کا نام بھی کلام غالب کی تراکیب سے ہی لیا ہے۔ اس کے علاوہ تراکیب کی کثرت بھی غالب سے مستعار ہیں

جس طرح غالب نے اپنے عہد کو نئے استعارے، نئی تشبیہات اور نئی تراکیب دے کر جدت پیدا کی، بالکل اسی طرح فیض نے بھی نئی تراکیب، نئی تشبیہات اور نئے الفاظ سے اردو شاعری کو جدت آشنا کیا۔

اس ضمن میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> یہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ منٹو ہوں یا فیض ان سب نے اپنے عنوانات، موضوعات اور تراکیب تک میں غالب کے چراغ سے چراغ جلائے ہیں۔ (۲)

عام طور پر ہر ممتاز ادیب یا شاعر کو پڑھتے وقت اس کی انفرادیت کے باوجود کئی ادیب یا شاعر ایسے ذہن میں آتے ہیں جو اس کی تخلیقات میں جلی یا خفی اثرات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اسی طرح فیض کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت غالب یاد آتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ فیض کے ہاں غالب کے فکری وفنی اثرات پائے جاتے ہیں۔غزل کی یہ خوبی ہے کہ اس کے اشعار جلد یاد ہو جاتے ہیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' میں حالی نے لکھا ہے کہ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔اس موضوع پر بات کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> غزل کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شاعر کے یہاں اس نوع کے شعر مل جائیں گے۔۔۔۔۔غزل میں ''یاددہانی'' کی ایک عجیب کیفیت پائی جاتی ہے جو نظموں میں بہت کم ملتی ہے۔نظم اپنی تمام وسیع النظری کے باوصف ایک انفرادی تجربہ ہوتی یا بن جاتی ہے۔غزل اپنی تنگ نظری کے باوجود اجتماعی تجربے کو سمیٹ لیتی ہے۔ایک شعر بہت سے اشعار کی یاد دلاتا ہے۔یادوں کے سلسلے پھیلتے جاتے ہیں۔میر، غالب، حافظ، سعدی، عرفی، نظیری اور بہت سے شعرا اپنی

تمام انفرادیت کے باوجود ایک دوسرے سے ہم رشتہ اور ایک دوسرے کے ہم زبان بن جاتے ہیں۔(۳)

فیض پر غالب کے فکری اور فنی دونوں طرح کے اثرات پائے جاتے ہیں۔اسی حوالے سے ڈاکٹر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:

فیض غالب سے متاثر ہیں لیکن ان کا آہنگ غالب سے مختلف ہے، غالب کا اثر فیض کی فکر پر زیادہ ہے اور فن پر کم ہے۔(۴)

اسی طرح فیض کے ڈکشن کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

جہاں تک ڈکشن کا تعلق ہے، فیض کا ڈکشن غالب اور اقبال کے ڈکشن کی توسیع ہے۔فیض کی تمام لفظیات فارسی اور کلاسیکی شعری روایت کی لفظیات سے مستعار ہے۔(۵)

جدت ادا، کلاسیکی روایت اور انسان دوستی تینوں میں فیض غالب کے قریب ہیں لیکن اس کے باوجود فیض نے اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا۔ان کا تخیل اور تفکر غالب کے قریب ہونے کے باوجود اپنا الگ رنگ ڈھنگ رکھتا ہے۔ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں:

فیض کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایک ذہین آدمی کی طرح غالب سے فیض اٹھایا اور غالب کے افکار ونظریات کو من وعن قبول نہیں کیا قطع وبرید ،کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ سے بھی کام لیا۔یہ تو غالب کی ہمہ گیری، آفاقیت اور ہمہ جہت دل آویزی ہے کہ ہر نوع کے افراد کو متاثر کرتے ہیں۔لیکن بیسویں صدی کے بیشتر دانش وروں نے بقدر آگہی غالب سے عام طور پر اور فیض نے خاص طور پر فیض اٹھایا اور اپنے فن کو بااعتبار بنایا۔(۶)

نفس مضمون کے حوالے سے بھی فیض غالب کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔فیض نے خود کہا ہے کہ انسانی محسوسات کے سب تیور غالب نے بیان کر دیے ہیں۔جس طرح غالب کے کئی اشعار اور مصرعے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اسی طرح فیض کے

بہت سے مصرعے اور اشعار اپنے اندر ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

چارہ ساز کے منت کش نہ ہونے پر غالب کا شعر مشہور ہے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

فیض کہتا ہے:

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

گو غالب و فیض کے اشعار ردیف و قافیہ میں مختلف ہیں، لیکن مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔(۷)

مذکورہ امر کی تائید نظیر صدیقی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:

نقش فریادی" میں کل بارہ غزلیں ہیں۔ یہ غزلیں مختلف آوازوں، مختلف رنگوں اور مختلف لہجوں سے عبارت ہیں۔ ان میں سے کوئی آواز، کوئی رنگ، کوئی لہجہ فیض کا نہیں، لیکن ہر ایک کی دل آویزی اور دامن کشی مسلم ہے۔ ابتدائی چند غزلوں میں غالب کا بڑا خوش گوار اثر ملتا ہے۔ فیض پر غالب کا اثر صرف غالب کی سی خوب صورت فارسی ترکیبوں کے استعمال تک محدود نہیں۔ ان کے یہاں غالب کی وہ افسردگی بھی پائی جاتی ہے جو ان (غالب) کے اس قسم کے مصرعوں سے مترشح ہے

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فیض کی نظموں کی طرح ان کی غزلوں میں بھی تخیل سے زیادہ تاثر کی کار فرمائی ملتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کی غزلوں میں تخیل اور تاثر کی وہ ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے جو غالب کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔ غالب کے رنگ میں فیض کے چند شعر دیکھتے چلیے:

حسن مرہونِ منت جوشِ بادہ باز
عشق منت کشِ فسوں نیاز
دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گم شدہ آواز
عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں
منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے
فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے" (۸)

قافیہ اور ردیف کے فرق کے ساتھ فیض کے پہلے شعری مجموعے "نقش فریادی" میں اور بھی غزل کے اشعار ایسے ہیں جن کا مضمون غالب سے ملتا جلتا ہے۔ دیوانِ غالب کا مطلع سرِ دیوان "نقش فریادی" کی ترکیب سے شروع ہوتا ہے تو فیض کی شاعری کا اولیں طلوع بھی نقش فریادی کے نام سے ہوتا ہے۔ ذیل میں "نقش فریادی" (۹) سے ایسے اشعار اور مصرعے درج کیے جاتے ہیں جو قارئین کو غالب کی یاد دلاتے ہیں۔ خاص طور پر تراکیب تو غالب سے ہی مستعار ہیں۔

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
تو ہے اور اک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

....

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازۂ خمار نہیں

تری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں
فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

نظم ""سرود"" سے ایک شعر:

نا خدا دور ہوا تیز قریں کام نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

....

ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

....

عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں، مت پوچھ

نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" کا شعر ہے:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اس شعر کے پہلے مصرعے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے ساری جدید غزل غالب کے لہجے، جہت اور مزاج سے متاثر ہے اور اس میں رہبر، رہزن، سایا، جنوں، قلم، خنجر اور خوں وغیرہ الفاظ کے نئے علامتی مفاہیم براہ راست غالب سے آئے ہیں۔ مثلاً فیض کا وہ کلام لے لیجیے جو گہرے سیاسی شعور کے لیے بہت مشہور ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فیض غالب سے کس قدر متاثر تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے دو مجموعوں یعنی "نقش فریادی" اور "دست تہ سنگ" کے نام تک غالب سے مستعار ہیں، اپنے متعدد اشعار میں بھی فیض نے غالب سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فیض صاحب کا ایک مصرعہ:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور غالب کا مصرعہ ہے:

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اسی طرح فیض کہتے ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم
کہ خوں دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اور غالب کا شعر ہے:

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اس کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا" (۱۰)

اس ضمن میں "نقش فریادی" سے مزید اشعار اور مصرعے ملاحظہ فرمائیں۔

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

نظم "شاہراہ" کا ایک شعر:

وصل محبوب کے تصور میں
مو بمو چور عضو عضو نڈھال

....

فیض ہوتا رہے جو ہونا تھا
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

فیض کے دوسرے شعری مجموعے "دست صبا" سے کچھ اشعار اور مصرعے ملاحظہ کیجیے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی ،وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے

....

نجات دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

نظم "طوق و دار کا موسم" سے شعر:

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائش حسنِ نگار کا موسم

....

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

نظم "نثار تری گلیوں کے" سے ایک مصرعہ:

کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بجھا جو روزنِ زنداں تو یہ دل سمجھا

....

آئے کچھ ابر ، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

....

ذکرِ دوزخ ،بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اب فیض کے تیسرے شعری مجموعے "زنداں نامہ" سے کچھ اشعار اور مصرعے جو غالب کی لفظیات اور تراکیب کی یاد دلاتے ہیں۔ غالب نے ۱۸۴۷ء میں جیل میں رہ کر "زندان نامہ" تحریر کی اور قریب قریب ایک صدی بعد فیض کو بھی جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ اس دورانیہ کی شاعری "زنداں نامہ" میں شامل ہے۔ ایک طرف تو یہ دلچسپ مماثلت بھی ہے لیکن دوسری طرف تخلیقی سطح پر دونوں کے ہاں ردعمل کی

نوعیت مختلف نظر آتی ہے۔یوں اس حوالے سے غالب اور فیض میں بعد المشر قین بھی نظر آتا ہے۔جیل کے اثرات دونوں کی طبائع پر تضاد اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے دونوں کے ہاں مماثلت اور تضاد کے پہلو بڑی خوبصورتی سے واضح کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

غالب اور فیض دونوں قید و بند کے تجربے سے گزرے اور دونوں کو قمار بازی کے الزام میں سزا ملی۔اس فرق کے ساتھ کہ غالب پر تو عام سی جوا بازی کا الزام تھا جب کہ فیض سیاسی نوعیت کی قمار بازی کے مرتکب ہوئے۔جوا بازی کی نوعیت کے فرق کے باعث ان دونوں کے ہاں نتائج کا فرق بھی مرتب ہوا۔وہ یوں کہ غالب کو تو بدنامی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور اس میں زمانے کا سامنا کرنے کی سکت نہ رہی مگر فیض کو قید و بند کے واقعہ نے پر پرواز عطا کر دیے اور وہ ہردلعزیزی کی ایک گرم و گداز فضا میں شہرت کے ساتوں افلاک کو پار کر گئے مگر پھر اس کے کچھ دیگر اثرات بھی مرتب ہوئے بالخصوص تخلیق کاری کے سلسلے میں! غالب، جس کے دل میں پہلے ہی بہت سی خراشیں اور دراڑیں پڑ چکی تھیں اس حادثے کی تاب نہ لا کر ایک تمثال دار آئینے کی طرح کرچ کرچ ہوا مگر پھر شکستہ ہو کر نگاہ آئینہ ساز میں عزیز تر ہو گیا اور یوں تخلیقی اعتبار سے آخری دم تک فعال رہا جب کہ فیض کا آئینہ دل جو ذاتی سطح کے واقعات اور حادثات سے متاثر ہو چکا تھا قید و بند کے واقعہ سے کچھ مزید متاثر ہوا مگر پھر اس کے بعد زمانے کی طرف سے ملنے والی محبت اور عقیدت نے ان کے آئینہ دل کی کرچیوں کو اس خوب صورتی سے جوڑ دیا کہ فیض اس داخلی شکست و ریخت ہی سے محروم ہو گئے جو تخلیق فن کے لیے بہت ضروری ہے۔۔۔۔لہٰذا زندگی کے آخری بیس سال میں ان کے ہاں تخلیق کاری کا گراف بتدریج زمیں بوس ہوتا چلا گیا جب کہ غالب تخلیقی اعتبار سے دم واپسیں تک پوری طرح زندہ رہا۔(۱۱)

''زندان نامہ'' سے چند تراکیب پیش خدمت ہیں: بہار شمائل، کوچہ یار، ہوس مطرب اور

ایک مصرعہ:

ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

چند اور مثالیں جو دیگر مجموعوں میں شامل ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے (دستِ تہ سنگ آمدہ)

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ دام

اسی مذکورہ مجموعے کی ایک نظم ''ختم ہوئی بارشِ سنگ'' کا آخری شعر غالب کا شامل کیا ہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اسی طرح تضمین کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ نظم ''رنگ ہے دل کا مرے'' کا ایک شعر:

رنگ ہے دل کا مرے، ''خونِ جگر ہونے تک''

نوحۂ غم ہی سہی شورِ شہادت ہی سہی

صورِ محشر ہی سہی بانگِ قیامت ہی سہی

(شامِ شہرِ یاراں)

ہر ایک عقوبت سے ہے تلخی میں سواتر

وہ رنج جو ناکردہ گناہوں کی سزا ہے

''مرے دل مرے مسافر'' کی ایک نظم ''دلِ من مسافرِ من'' کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

ہمیں دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

کبھی اُس سے بات کرنا

تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے

شبِ غم بُری بلا ہے

ہمیں یہ بھی تھا غنیمت

جو کوئی شمار ہوتا

ہمیں کیا بُرا تھا مرنا

اگر ایک بار ہوتا

حواشی

۱۔ انور سدید، غالب کا جہاں اور، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱

۲۔ پروفیسر محمد حسن، "غالب صدیوں کے آئینے میں" مشمولہ جہات غالب (مرتب) ڈاکٹر عقیل احمد، شاہد پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص ۱۳

۳۔ مجتبیٰ حسین، نقش فریادی کی غزلیں، مشمولہ فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ) ترتیب، ڈاکٹر طاہر تونسوی، اقرا انٹر پرائزر، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳

۴۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخ جدید اُردو غزل، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع دوم، ۲۰۰۰ء

۵۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، "فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام" مشمولہ، شاعر خوش نوا۔ فیض احمد فیض، ترتیب، تہذیب اور انتخاب، ڈاکٹر طاہر تونسوی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۱ء،

۶۔ ڈاکٹر آغا سہیل، فیض اور غالب، مشمولہ، فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ) محولہ بالا ۳، ص ۲۰۹

۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، فیض کی شاعری، مشمولہ، شاعر خوش نوا۔ فیض احمد فیض، محولہ بالا ۵، ص ۱۰۶

۸۔ نظیر صدیقی، شہنشاہ شمشاد قداں، مشمولہ، شاعر خوش نوا۔ فیض احمد فیض، محولہ بالا ۵، ص ۲۶

۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور، س۔ن، مقالہ ھذا میں تمام شعری حوالے اسی کلیات سے لیے گئے ہیں۔

۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غالب اور فیض، سہ ماہی ادبیات، فیض احمد فیض نمبر، جلد ۱۹، شمارہ ۸۲، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۔۳۱

''یادگارِ غالب'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

''یادگار غالب'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

خواجہ الطاف حسین حالی کی ''یادگار غالب'' مرزا اسد اللہ خاں غالب کی پہلی سوانح عمری ہے جو ۱۸۹۷ء میں مطبع کانپور سے شائع ہوئی، کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غالب کے حالات و واقعات زندگی ہیں اور دوسرے میں غالب کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب ہے۔ ساتھ ہی مرزا کی فارسی نظم و نثر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ سوانحی حصے میں ۴۸ مختلف عنوانات کے تحت غالب کی زندگی کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح سوانحی حصہ ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ بقول غلام رسول مہر:

> یادگار غالب'' کو یہ شرف حاصل ہے کہ غالب کے سوانح پر یہ پہلی باقاعدہ سوانحی تصنیف ہے اور اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے دنیائے ادب کو غالب سے متعارف کروایا۔ غالب کو آج ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی حاصل ہے اس کے پیدا کرنے میں ''یادگار غالب'' کا بہت بڑا حصہ ہے(۱)

یہ کتاب ''غالبیات'' میں سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہے اگر یوں کہا جائے کہ ''غالبیات'' کے تن آور درخت کا بیج ''یادگار غالب'' ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ یہ کتاب نہ صرف سوانح غالب کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے بلکہ ماخذ کے لحاظ سے بھی کافی حد تک معتبر ہے۔ غالب کے حالات زندگی کے بارے میں یہ کتاب ''بنیادی ماخذ'' کا درجہ رکھتی ہے۔ بقول اسماعیل پانی پتی:

> غالب کی سوانح حیات ''یادگار غالب'' مولفہ مولانا الطاف حسین حالی،

درحقیقت ان کی ابدی یادگار ہے اور جب تک اردو زبان قائم ہے اور جب تک غالب کو جاننے والے موجود رہیں گے ،اور اس وقت تک یادگار غالب بھی زندہ رہے گی ۔۔۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جارہی ہے کہ آئندہ جب کوئی شخص غالب کی زندگی اور حالات پر قلم اٹھائے گا۔ وہ یادگار غالب سے بھی مستغنی نہیں کر سکے گا۔(۲)

تقدم زمانی اور تحقیقی لحاظ سے مستند ہونے کے ضمن میں عبدالقوی دریا آبادی لکھتے ہیں:

غالب پر اب تک بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ سوانح عمریاں بھی اور کلام کی شرح اور اس پر تبصرہ بھی اور ان میں سے بعض کتابیں خاصی ضخیم بھی ہیں اور بعض میں ریسرچ کی موشگافیاں بھی کی گئی ہیں، لیکن حالی کی یادگار غالب کو نہ صرف تقدم زمانی کی فضیلت ہے۔ بلکہ اس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی جس قدرت کا ثبوت دیا گیا ہے اس کی مثال ''غالبیات'' کی کسی کتاب میں نہیں ملتی اور غالب پر بعد میں جس نے بھی قلم اٹھایا اس نے بہرحال یادگار غالب کو ہی پیش نظر رکھا اور اپنے سارے ماخذوں میں سب سے زیادہ موثق و مستند سمجھنا پڑا ہے۔ (۳)

مولانا حالی چونکہ غالب کے شاگرد بھی تھے اور کچھ عرصہ ان کے پاس رہے بھی تھے یوں غالب کے بعض واقعات کے چشم دید گواہ بھی تھے۔اسی بناپر بعض واقعات کا بیان جیسا ''یادگار'' میں ملتا ہے کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتا۔اس حوالے سے چند واقعات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے کہ کس طرح حالی کا قلم غالب کی حالت اور ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

۱۔ جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہوگیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب وشتم بھیجنے شروع کئے جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن وملامت وغیرہ لکھی ہوئی تھی۔ ان دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی ،نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا اور اس خیال سے کہ مبادا کوئی اس قسم کا خط نہ آیا ہو۔ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔

۲۔ مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے ،چٹھی رساں نے ایک لفافہ آکر دیا لفافے کی بے ربطی اور کاتب

کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو سارا خط فحش دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پورا اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں، تا کہ اس کو غیرت آئے، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیوں کہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیوں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

۳۔ مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی، پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کیلئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے، جس روز انتقال ہوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خان مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی کا شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسائیوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں آ رہا۔ دوسرا مصرعہ یہ تھا:

فکر و ہجر مدارا ہمن۔ سر تو سلامت

یہ چند ایسے واقعات ہیں جن کو حالی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا اور اگر وہ اسے بیان نہ کرتے تو یہ واقعات کبھی منصۂ شہود پر نہ آتے۔ اس حوالے سے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہٰذا اکثر واقعات چشم دید لکھتے ہیں۔ مشکل اشعار کے معنی بھی سمجھائے ہیں اور ان مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہے گئے تھے۔ (۴)

بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی:

> "یادگار غالب" کی یہ خوبی ہے کہ بعض واقعات کا سوانح نگار خود چشم دید گواہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "یادگار غالب" میں "شنیدہ" کے ساتھ ساتھ "دیدہ" کی بھی جھلکیاں موجود ہیں۔ (۵)

غالب کی طبیعت میں جو مزاح کی حس تھی، حالی نے اسے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اکثر سوانح نگاروں مثلاً مالک رام (ذکر غالب) اور شیخ محمد اکرام (حیات غالب) نے حالات غالب کے بیان میں اس پہلو کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ مرتب شدہ آپ بیتیوں کے مرتبین نے بھی لطائف غالب کو بغیر سیاق وسباق کے ایک ہی عنوان کے تحت درج کیا ہے۔ حالی چونکہ غالب کے شاگرد تھے اور موقع محل کو بہتر جانتے تھے اس لئے انہوں نے لطائف بھی اپنے اپنے موقع محل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ "یادگار غالب" میں حالی غالب کے "حسن بیان اور ظرافت" کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے"۔ اس ضمن میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ پنشن کی بندش کے سلسلے میں میر مہدی مجروح کے استفسار کا جواب یوں دیتے ہیں۔

میاں! بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

واقعہ قید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آ کر قید سے رہائی کی مبارک باد دی۔ مرزا نے کہا!

کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔

غالب کی خوراک کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا اور دستر خوان بچھا، برتن تو بہت تھے مگر کھانا بہت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا کہ اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کو دیکھئے تو بایزید کا۔

بعض محققین نے "یادگار غالب" کے ضمن میں لکھا ہے کہ واقعات میں بے ترتیبی، خلا اور انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں:

> یادگارغالب" کے پہلے حصے کو ہی لے لیجئے جس میں غالب کے واقعات زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں زندگی کے واقعات نہ تو تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اور نہ ترقی وار۔(۶)

حالی نے سوانح غالب کے ابتدائی واقعات کو بہتر تسلسل سے بیان کیا ہے۔مثلاً تاریخ ولادت، خاندان، شادی، مسکن، تعلیم، مطالعہ کتب، قیام لکھنو اور سفر کلکتہ وغیرہ۔ غالب نے قید کے دوران جو ترکیب بند لکھا ہے اس پر تفصیلاً تبصرہ کیا ہے اور ترکیب بند کے اشعار درج کئے ہیں۔ غالب کی تصنیف "قاطع برہان" پر تحقیقی انداز اپنایا ہے اور وضاحت سے دلائل دیے ہیں۔اس ضمن میں مختلف فرہنگوں سے مدد لی اور "قاطع برہان" کی نمایاں اغلاط کی نشان دہی بھی کی۔

حالی نے اس موضوع پر اتنی تحقیقی معلومات بہم پہنچائیں ہیں کہ "قاطع برہان" کو پڑھے بغیر بھی قاری اس سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔اس ضمن میں نہ صرف غالب کی تائید کی ہے بلکہ اعتراضات بھی کیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض بھی کیے ہیں۔ خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اس کو عربی الاصل ماخوذ از سف قرار دیا ہے۔اور اس غلطی کا انہوں نے آخرکار خود بھی اعتراف کیا ہے اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے ۔

بقول عبدالماجد دریابادی:

> حالی نے اس معرکے کا حال اس کتاب کی عام روش اختصار کے خلاف بڑی تفصیل سے لکھا ہے اگرچہ اس بحث میں انہوں نے مرزا ہی کو حق بجانب ٹھرایا ہے تاہم انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔اور چند مقامات پر خود مرزا کی لغزش کا بھی اعتراف کھل کر کیا ہے۔(۷)

سفر کلکتہ کے حوالے سے حالی نے مختصراً صرف پانچ درخواستوں کا ذکر کیا ہے۔اس سفر کے آغاز اور انجام کی تاریخوں اور سالوں سے حالی نے قارئین کو بے خبر رکھا ہے۔صرف

اس شمارے پر اکتفا کیا ہے: "غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب وہ لکھنو ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے" حالانکہ اس وقت غالب کی عمر ۳۱ سال تھی۔ مجادلہ اہل کلکتہ کے سلسلے میں حالی نے مثنوی "باد مخالف" کے مختلف مقامات سے ۷۹ (اناسی) اشعار درج کیے ہیں۔ اس ضمن میں حالی نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ مذکورہ مثنوی ہی کو حوالہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس بارے میں عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

> قتیل سے غالب کے مباحثہ نے بالا آخر مجادلہ و مکابرہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے ذکر کے سلسلے میں حالی نے ان کی فارسی مثنوی باد مخالف کے اشعار مختلف مقامات سے پیش کر کے غالب کی وکالت خود غالب کی زبانی انجام دی ہے۔ (۸)

حالی پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جانبدارانہ رویہ اپنا کر غالب کے واقعہ قید کو برائے نام اور گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے "یادگار" میں حالی نے مرزا کے فارسی خط کا اردو ترجمہ دیا ہے اور فارسی ترکیب بند کے اشعار بھی نقل کیے ہیں جس سے غالب کی ذہنی قلبی کیفیات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ حقیقت میں اس دور میں جوا اور قید کا کسی شخصیت کے ساتھ منسلک ہونا اس کی عزت پر حرف آنے کے مترادف ہوتا تھا۔ اس بنا پر کوئی مصنف بھی ایسی باتوں کو زیادہ ہوا نہ دیتا تھا۔ اس ضمن میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> حالی نے یہ کتابیں جس زمانہ میں لکھی ہیں۔ اس زمانہ میں لوگ بعض حقیقتوں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ آج اگر یہ ثابت ہو جائے کہ غالب واقعی جوا کھیلتے تھے تو اس سے غالب کی عظمت پر کوئی حرف نہ آئے گا مگر انیسویں صدی اس قدر روادار نہیں تھی، وہ صرف فرشتہ صفت لوگوں کو ہیرو بناتی تھی۔ انسانی کمزوریاں اس کے نزدیک قابل معافی نہ تھیں۔ (۹)

یہ درست ہے کہ "یادگار غالب" میں سوانحی جزئیات کی کمی پائی جاتی ہے لیکن بعض جزوی واقعات اس نوعیت کے ہیں کہ حالی کے بغیر ان کا ظہور میں آنا ناممکن تھا۔ مثلاً غالب

کی بدیہہ گوئی جس میں قیام کلکتہ میں گیارہ شعر کا قطعہ جو غالب نے ارتجالاً کہا تھا چکنی ڈلی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح خط، شعر خوانی۔ فکر شعر، شعر فہمی وغیرہ۔ اس کے علاوہ دو واقعات بظاہر جزوی لیکن سوانح میں اہم ہیں، کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلا واقعہ شاعری کے ضمن میں ہے کہ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اسی زمانے میں انہوں نے کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے جن کی ردیف میں ''کہ چہ'' بجائے ''یعنی چہ'' کے استعمال کیا گیا تھا۔ جب انہوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو انہوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ ''کہ چہ'' کے یعنی ''چہ'' کے معنی میں آیا تھا، وہ کتاب لے کر دوڑے دوڑے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مرزا سے کہا: تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکر شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پرواہ نہ کیا کرو۔

میر والی حکایت کے بارے میں لکھتے ہیں ''خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے، جو مرزا کے ہم وطن تھے، ان کو لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

اب ''یادگار غالب'' کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو تحقیقی اور فن سوانح نگاری کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ حالی نے لکھا ہے ''ایک دفعہ بہادر بادشاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے۔ وہ بھی لکھنو سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ یہ بیان درست نہیں اس بارے میں سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

- خواجہ حالی کے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں جن میں دو بہت نمایاں ہیں۔

ایک یہ کہ انہوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر کا بھتیجا بتایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ، مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ان کے بیٹے مرزا کام بخش کے بیٹے تھے یعنی مرزا سلیمان بخش شکوہ کے بڑے بھائی تھے۔ اس لئے مرزا حیدر شکوہ اکبر بادشاہ کے بھتیجے نہیں بلکہ پوتے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ کے بیٹے تھے اس لئے وہ مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوئے مرزا حیدر شکوہ اپنی مثنوی "شوکت حیدری" میں خود کہتے ہیں:

جناب بہادر شہ نامدار
کہ ہم عم ماست وہم سہر یار (۱۰)

حالی نے لکھا ہے کہ "بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا" بقول سید مسعود حسن رضوی:

> مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب کی مثنوی کا نہیں بلکہ شیخ امام بخش صہبائی کی مثنوی کا نام تھا۔۔۔ غالب کی زیر بحث مثنوی کا نام غالباً کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔(۱۱)

مذکورہ مثنوی کے اصل نام اور جواب میں لکھی جانے والی مثنوی کے حوالے سے سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

> مولوی سید محمد صاحب کے بھتیجے سید علی نقوی کی قلمی کشکول حکیم سید علی صاحب آشفتہ کے پاس موجود ہے اس میں غالب کی یہ مثنوی بھی نقل کی گئی ہے اس کے عنوان پر "مثنوی مرزا نوشہ غالب" لکھا ہے۔(۱۲)

مزید لکھتے ہیں کہ:

> غالب کی مثنوی کے جواب میں آتش کے شاگرد میر دوست علی خلیل نے "مثنویات شیعیان علی در رد مثنوی جعلی دجلی" کے نام ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ اس مثنوی کے جواب میں شیخ امام بخش صہبائی نے "دمغ الباطل" کے نام سے

ایک مثنوی کہی جو ۱۲۷۰ھ میں افضل المطابع دہلی میں چھاپی گئی۔ (۱۳)

اس ضمن میں خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

> حالی کا یہ بیان غلط ہے "مثنوی دمغ الباطل" کے مصنف مولوی امام بخش صہبائی ہیں۔ مرزا غالب کی مثنوی کا نام "کلمات طیبات" ہے۔ (۱۴)

حالی قیام لکھنو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب مرزا دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنو کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنو آئیں۔ اس لئے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنو بھی دیکھتے چلیے۔

حالی کا یہ بیان درست نہیں ہے۔ بقول غالب:

> اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کی ملنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب بھی نہ مل سکا۔ اس لئے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کر کے کرائے کے ایک فینس میں مجھے لکھنو کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنو میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا۔ (۱۵)

لکھنو کے حوالے سے حالی لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں رواں اور روشن الدولہ نائب سلطنت تھے۔ اس ضمن میں خلیل الرحمٰن داؤدی لکھتے ہیں:

> یہ غلط ہے کہ مرزا غالب، نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنو پہنچے۔ مرزا غالب نہ صرف لکھنو سے بلکہ باندہ سے بھی نکل چکے تھے کہ انہیں نواب احمد بخش خان والئی فیروز پور کے انتقال کی خبر ملی نواب احمد بخش خان کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء میں ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ا کتوبر ۱۸۲۷ء سے بہت پہلے مرزا لکھنو سے گذر گئے تھے۔ غازی الدین حیدر کا انتقال ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا اس کے بعد نصیر الدین بادشاہ بنے، لیکن ۱۹ اکتوبر سے بہت پہلے مرزا غالب لکھنو سے گذر گئے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس

> وقت مرزا غالب لکھنو پہنچے ہیں تو نصیر الدین کا نہیں بلکہ غازی الدین حیدر کا دور تھا۔۔۔ یہ بھی غلط ہے کہ اس زمانے میں روشن الدولہ نائب سلطنت تھے۔ روشن الدولہ نومبر ۱۸۳۲ء میں نائب السلطنت ہوئے۔ اسوقت مرزا غالب کو کلکتے سے آئے ہوئے بھی دو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ مرزا غالب جس زمانے میں لکھنو گئے ہیں۔ وہ معتمد الدولہ آغا میر کا عہد تھا۔(۱۶)

حالی نے لکھا ہے کہ غالب کو ۱۸۴۶ء میں قید کا واقعہ پیش آیا۔ یہ بھی درست نہیں ہے بلکہ یہ واقعہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا۔ بقول خلیل الرحمٰن داوٴدی:

> لالہ گھنشیام لال عاصی دہلوی، کے شاگرد شاہ نصیر الدین دہلوی نے اس حادثے کے متعلق ایک قطعہ تاریخ نظم کیا تھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس کے مادہ تاریخ سے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء بر آمد ہوتا ہے۔(۱۷)

حالی لکھتے ہیں کہ جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے۔ نہ اس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا۔ یہ بیان درست نہیں۔ بقول خلیل الرحمٰن داوٴدی:

> غالب کے پاس برہان قاطع کا قلمی نہیں بلکہ مطبوعہ نسخہ تھا جو آج بھی لوہارو سیکشن، رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ (۱۸)

حالی نے لکھا ہے کہ مثنوی ''ابر گوہر بار'' مرزا غالب کی آخری تصنیف تھی اور یہ مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے، دونوں بیانات درست نہیں۔ اس ضمن میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں:

> کلکتے کے سفر ۲۹۔۱۸۲۷ اور واپسی کے بعد سے غالب کی اس نا تمام مثنوی کا چرچا اہل نظر میں ہونے لگا۔۔۔۱۸۴۵ء کے قریب تو یہ مثنوی قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی اب ہمیں ملی ہے اور دیوان کی گیارھوں مثنوی ہے بارھویں کوئی نہیں۔ یہ مثنوی، مثنوی کی تمہید ہے جو ایک ہزار اٹھانوے

> (۱۰۹۸) شعروں پر پھیلی ہوئی ہے اور ابھی یہ تمہید مکمل ہو پائی تھی کہ غالب دربار کی آخری بساط پر جا بیٹھے۔ سات برس پورے نہ ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں وہ بساط الٹ گئی اور غالب کو اتنی سکت رہی، نہ وہ سکون میسر آسکا، جو ایسے کاموں کے لیے لازمی ہے۔(۱۹)

حالی نے غالب کے دربار میں شیعہ ہونے کی خبر اور بہادر شاہ ظفر کا غالب سے استغفار کے حوالے سے صرف ایک ہی رباعی لکھی ہے۔اس بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

> حسن اتفاق سے اس سلسلے کی باقی چار رباعیاں سراج اخبار کے جس شمارے میں شائع ہوئی وہ مل گیا ہے (سراج الاخبار، ۸:۲۸ (۱۶نومبر ۱۸۵۰ء)۔(۲۰)

حالی لکھتے ہیں کہ قید میں ان کو کسی طرح تکلیف نہیں ہوئی وہ بالکل قید خانے میں اس آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا اور کپڑا تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھی۔ان کے دوست ملتے جاتے تھے۔

حالانکہ نواب مصطفے خان شیفتہ کے علاوہ جیل میں غالب کی ملاقات کو کوئی شخص نہیں گیا اور جیل میں کافی سختی اور پریشانی میں غالب کو رہنا پڑا تھا۔اس بارے میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> گھنشام داس عاصی کے مطابق جیل میں برے حال تھے۔ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ان کی حالت زار دیکھ کر سول سرجن نے طبی بنیادوں پر غالب کی قبل از وقت رہائی کی سفارش کی تھی۔(۲۱)

حالی نے غالب کی کرنل برون کے سامنے پیشگی کے ضمن میں لطیفہ لکھا ہے کہ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> غلام حسین خان نے اپنی فارسی کتاب میں جس کا ملخص ترجمہ "غدر کا نتیجہ"

کے نام سے شائع ہوا ہے، لکھا ہے کہ گورے غالب کو گرفتار کو کے کرنیل
برن (کذا) کے پاس لے گئے مرزا کی زندگی ابھی باقی تھی، ان کے
دوست اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، انہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی
دلوا دی۔ (۴۲)

حالی نے غالب کے سر معروف کے کہنے پر شجرہ کی نقل لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

یادگار غالب میں منظوم شجرے کی نقل کے متعلق جو حکایت ہے وہ میرے
نزدیک مصنوعی ہے حالی کے پاس اس کی کوئی سند نہیں اور واقعہ حد درجہ
خلاف قیاس ہے۔ (۴۳)

حالی نے غالب "دادِ سخن" کے ضمن میں ذوق کا شعر درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جا بجا ذکر جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ حالی نے یہ لکھا ہے کہ غالب شطرنج کھیل رہے تھے کہ غلام علی خان (وحشت؟) نے ذوق کا یہ شعر پڑھا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب کے کان جو بھنک پڑی بار بار پڑھوا کر سنا اور سر دھنتے رہے اور مصنف کا نام معلوم ہوا تو نہایت متعجب ہوئے لیکن بقول قاضی عبدالودود:

غالب کے صرف خط میں اس کی تعریف ہے اور اس میں مصنف کا نام نہیں
، بلکہ گمان یہ ہوتا ہے کہ غالب کو اس کا پتہ نہیں کہ کس کا ہے غالب نے ایسے
کسی موقع پر جہاں اچھے شعر کی مثالیں دی ہیں یہ شعر درج نہیں
کیا۔ (۴۴)

حالی نے مثنوی "مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب نے مولانا فضل حق کے اصرار پر یہ مثنوی وہابیوں کے خلاف لکھی۔ بقول عبدالعزیز ساحر:

حقیقت یہ ہے کہ:

(الف) اس مثنوی کا مولانا حق خیرآبادی کی فرمائش سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) یہ مثنوی ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور اس وقت مولانا موصوف کے علمی حریف شاہ اسماعیل دہلوی کو فوت ہوئے اکیس سال گزر چکے تھے۔

نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنے ایک مقالے میں اس مثنوی کی تحریر اور اشاعت کے سلسلے میں تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حقی) دہلوی کی تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیل ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ/ جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم ومرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ شاہ جہاں آبادی (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت دربار سے وابستہ اور "مہر نیم روز" کی ترتیب میں مشغول تھے۔ اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیل ارشاد ہوئی اور غالب نے اس مضمون کو نظم کر کے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گذرا۔
>
> بہادر شاہ کو یہ ترتیب وترجمانی بہت پسند آئی۔۔۔ بہادر شاہ نے اس کی فوراً طباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ (۲۵)

اس مثنوی کا اصل نام، بیان نموداری شان ونبوت وولایت کہ در حقیقت پرتو نورالانور حضرت الوہیت است ہے۔ یہ مثنوی عام طور پر مثنوی شان نبوت ولایت کے نام سے معروف ہے۔ ابتدا میں جب یہ مثنوی نظم ہوئی تو یہ ایک سو ایک (۱۰۱) اشعار پر مشتمل تھی بعد میں کہیں غالب نے اس کے آخری تین شعر حذف کر کے تیس (۳۰) اشعار کا اضافہ کر دیا۔

اس ضمن میں کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں:

مثنوی کی روایت اول کے ۱۰۱ اشعار میں سے ۳ شعر حذف کر کے ۳۰ شعر بڑھانے کا عمل اگر مولانا فضل حق خیر آبادی کی شہ پر روا رکھا گیا ہو تو ہو۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ اشعار قلم زد کرنے اور ۱۳۰ اشعار کا اضافہ کرنے میں بھی مولوی حق کا ہاتھ نہیں کیوں کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی واپس انگریزی فوج کے قبضے میں آیا۔ گویا ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہندوستان تھا۔

غالب سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ شعر:

بردعائے شہ سخن کوتاہ باد تا خدایا شد بہادر شاہ باد

مثنوی سے خارج کر دیا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ اگست ۱۸۵۲ء اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان فضل حق خیر آبادی دہلی میں رہے ہی نہیں تھے۔ وہ رام پور میں آٹھ سال رہ کر ۱۸۴۷ء میں یہیں سے لکھنو چلے گئے اور شاہ اودھ کی معزولی تک یہیں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔۔۔

یہ شعر "بردعائے شہ۔۔۔ دیوان غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء (مثنوی سرمہ بینش) میں شامل ہے۔ لہٰذا قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۸۴۵ء کا چھپا ہوا یہ شعر ۱۸۵۲ء کی مثنوی میں کیوں شامل کیا گیا ہے۔ میری رائے میں غالب نے مولانا محمد سالم کی تحریر کا منظوم ترجمہ دل جمعی سے نہیں کیا تھا اس میں شاہ کی مدح میں پہلے ہی کا کہا ہوا شعر آخر میں چپاں کر کے فراغت پائی مگر جب اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر دیا گیا تو غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظر ثانی کی اور تین شعر حذف کر کے اور تیس شعر بڑھا کر پوری مثنوی چھپا لی۔ پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیات فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی۔ (۲۶)

حالی نے غالب کے "خاندان" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایبک ترک کے قوم تھے۔ اس ضمن میں میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

میں نے شجرۃ الاتراک وغیرہ سے ڈھونڈا لیکن نہ پایا کسی اور جگہ بھی ایک ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں ملا۔ اپنی تحقیق پر بھروسہ نہ کر کے میں نے استاذ کی ولید طوقان (طوغان) سے ان کے ورودِ پٹنہ کے وقت اس کے متعلق دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا کہ آئی بمعنی ماہ ہے اور بگ بمعنی امیر ہے۔ یہ لقب ہے، ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں۔ (۲۷)

حالی لکھتے ہیں کہ قاطع برہان ۱۲۷۶ھ میں چھپی پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ اضافہ کر کے درفش کاویانی کے نام سے چھپوایا۔ اشاعت کے یہ دونوں سنین درست نہیں۔

These dates are not correct .Qatei Burhan waspublished in march 1862 [1278 A H]and dirafs'hi kawianiin 1865 [1282 A H] Qatei Burhan had been written in1859 ,as ghalib's letters show."[28]

سوانحی حوالے سے "یادگار غالب" میں واقعاتی خلا پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سفر کلکتہ کا ذکر پہلے کر کے بعد میں قیام لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حالی نے غالب کا قیام بنارس اور مثنوی "چراغ دیر" کا ذکر نہیں کیا۔ خاندان لوہارو کا غالب کی ذات سے گہرا تعلق تھا۔ حالی نے اس پر روشنی نہیں ڈالی۔ غالب کے سفر رام پور اور میرٹھ کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح غالب پر سکے کا الزام اور "حقے" کا ذکر نہیں کیا۔ پنشن کا قصہ غالب کی تقریباً تمام حیات کو محیط ہے اس کا ذکر انتہائی کم ہے۔ اس بارے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

خواجہ حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اتنا مجمل ہے کہ کوئی شخص اس سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیت معلوم نہیں کر سکتا۔ اور جس جھگڑے میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا جس کی وجہ سے ان کا دل مسلسل تین برس تک دل خوش کن توقعات کا مولد مشہد بنا رہا اس کی تفصیلات ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ (۲۹)

حالی نے لکھا ہے کہ کول برک صاحب جو اس وقت دلی میں ریذیڈنٹ تھے، انہوں نے دلی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ درست نہیں ہے۔

بقول غلام رسول مہر:

> یہ دعویٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ کول بروک نے کلکتہ جانے سے قبل دہلی میں غالب سے مفید مطلب رپورٹ کا وعدہ کر لیا تھا۔۔۔ کلکتہ میں مقدمہ پیش کرنے کے وقت انہیں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ ضابطہ کے مطابق مقدمہ پہلے ریزیڈنسی میں پیش ہونا چاہیے۔ وہ کلکتہ جا کر اور ضابطہ کا یہ حکم سن کر اپنی بے چارگی پر زور دیتے۔ (۳۰)

حالی نے لکھا ہے کہ غالب کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے درست نہیں ہے۔ وہ محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ بقول حالی غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں لکھا۔ بقول غلام رسول مہر:

> خواجہ حالی کا یہ دعوے صحیح نہیں۔۔۔ ان کے فارسی کلیات نظم میں کم و بیش چار قطعات ایسے ضرور ہیں، جنہیں بہر حال ہجو ہی کے ماتحت لانا پڑے گا البتہ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں سودا یا انشاء یا فارسی کے بعض ہجوگو شعرا کی سوقیت اور تسفل سے ملوث نہیں ہوتی تھی۔ (۳۱)

حالی نے غالب کے مذہب کے بارے میں کسی قطعیت کا اظہار نہیں کیا۔ غالب کی تعلیم اور عبد الصمد کے حوالے سے شاگردی کے مسئلے کو محض الجھایا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ان معلومات میں ہمیں حالی سے قدرے بہتر تحقیق کی توقع تھی مگر ان سے ہو نہیں سکی۔ (۳۲)

حالی کا بیان ہے کہ غالب نے تقریباً ۱۸۱۳ء-۱۴ تک اسد تخلص استعمال کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللطیف لکھتے ہیں:

> لیکن اس کے اردو دیوان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی اس کے لئے

> اس حصہ کلام کو ملاحظہ کیجئے جو پختہ عمر ۱۸۲۳ء تا ۱۸۵۵ء میں موزوں ہوا اس میں آپ کو کئی غزلیں ایسی ملیں گی جن میں اسد تخلص کیا گیا ہے۔ (۳۳)

''یادگار غالب'' میں سوانح نگاری کے فن کے حوالے سے بھی ایک نمایاں سقم سنین کا صحیح التزام نہ کرنا ہے۔ کہیں سن ہجری اور کہیں سن عیسوی کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً غالب کی پیدائش سن ہجری اور مرزا یوسف کی پیدائش سن عیسوی میں دیا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> اس (یادگار غالب) میں سنین کا التزام نہیں کیا گیا۔ یعنی ایک جگہ سن ہجری ہے اور دوسری جگہ عیسوی۔ اس طرح پڑھنے والے کو وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور تصور کی وحدت میں فرق آتا ہے۔ (۳۴)

عذر کے بارے میں حالی نے تفصیلات نہیں دیں۔ حالانکہ دستنبو اور غالب کے خطوط میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔ اسی طرح غالب کے نام تخلص، عرف، غالب کی مہریں اور ملازموں کا ذکر نہیں کیا۔ ''یادگار غالب'' میں غالب کے ''اخلاق و عادات و خیالات'' کا حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر ''یادگار غالب'' ہمیشہ یادگار رہی گی۔ حالی کی یادگار غالب سے پہلے ان واقعات سے کسی کو آگاہی حاصل نہ تھی۔ بعد میں آنے والے سوانح نگاروں نے بھی اس حصے سے سرمو انحراف نہیں کیا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> سوانح کے اعتبار سے یادگار کس قدر تشنہ ہے لیکن حالی نے کچھ ایسی آنکھوں دیکھی باتیں لکھ دی ہیں جو اور کسی ذریعے سے ممکن نہ تھیں۔ اخلاق و عادات و خیالات کا باب جامع اور مفصل ہے اس سے غالب کی ایسی دل کشی کی اور عظیم شخصیت سامنے آجاتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح ہمیں بھی رہ رہ کر یہ ارمان ہوتا ہے کہ کاش ہم اس سے ملے ہوتے۔ (۳۵)

گو ''یادگار'' میں واقعاتی خلا پایا جاتا ہے لیکن بہت سے جزوی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ شاعری پر تبصرے والے باب میں غالب کی شاعری کا عطر اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اس مشکل پسند اور جدت پسند شاعر کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

> بڑی تعداد میں مرزا کے منتخب اشعار درج کئے ہیں اور ان کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں آج جو ہم غالب کے بعض پہلو دار اشعار کے لطیف معنوں سے محظوظ ہوتے ہیں وہ یادگاری کی دین ہے شاید انہوں نے غالب سے سنے ہوں گے۔(۳۶)

غلام رسول مہر ''یادگار غالب'' پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اصل کتاب کم و بیش چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن ان چار سو صفحات میں غالب کے سوانح حیات کے صرف چھیانوے صفحے نکل سکے ہیں اور ان صفحوں میں غالب کے احباب کے سوانح بھی ہیں۔(۳۷)

اس بارے میں ''یادگار غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں:

> زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالی بھی بہت زیادہ زور نہیں دیتے۔ تینوں کتابوں (حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید) میں بہت کم صفحے حالات کی نذر کئے گئے ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ شخصیت اور اس کے کارنامے نمایاں کرنے پر رہتی ہے۔(۳۸)

اس ضمن میں حالی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ مرزا کی لائف میں کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں، ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کو لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالی نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔ آگے چل کر حالی لکھتے ہیں کہ اگر مرزا کی لائف جیسا

کہ ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے، ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرافی سے حاصل ہونے چاہیے۔

مذکورہ بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کا مقصود غالب کی سوانح عمری لکھنا نہ تھا بلکہ یہ تو محض تنقیدی کتاب کا مقدمہ تھا۔ کیوں کہ غالب پر یہ پہلی باقاعدہ سوانحی کاوش بھی تھی اس لئے قارئین نے اسے مرزا کی سوانح عمری پر محمول کیا۔ بقول شیخ محمد اکرام:

> لیکن ان (غالب) کی دل فریب شخصیت اور شاعرانہ عظمت کو پہلی بار حالی نے بے نقاب کیا تھا، جو علی گڑھ تحریک کا رکن تھا اور جس کی تالیف یادگار غالب میں اس تحریک اور اس کے رہنماؤں کی میانہ روی، واقعیت پسندی، لفاظی، اور لن ترانیوں سے اجتناب۔ یہ سب چیزیں پوری طرح نمایاں ہیں۔ حالی کی کتاب آج سے ساٹھ سال پہلے لکھی گئی۔ اور اس سے ان علوم (مثلاً علم نفسیات) کی واقفیت کی توقع، جو اس کے بعد رائج ہوئے اور ان سوالات کے جواب ڈھونڈنا جو آج پیدا ہوئے ہیں، عبث ہے، شاید جوں جوں وقت گزرتا جائے یادگار غالب کی اصل حیثیت تنقیدی نہیں ادبی نظر آئے گی۔ لیکن حالی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا اور اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے غالب کی شخصیت اور شاعری کو پہلی مرتبہ عوام سے روشناس کرایا۔ (۳۹)

یادگار غالب کے دیباچے میں حالی نے لکھا ہے کہ مرزا کی لائف کے لیے ان کی تصنیفات کو بھی دیکھنا ہے۔ بزرگوں اور دوستوں سے مطلوبہ کتابیں اور مرزا کے حالات اکٹھے کیے۔ لیکن یادگار کا مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے جو کچھ کہا اس پر پوری طرح عمل نہیں کر پائے۔ اصل میں تنقیدی حصے پر حالی کی زیادہ توجہ نے سوانحی حصے کو کمزور کردیا۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

> کتاب میں ہیئت کے اعتبار سے بے ڈھنگا پن پیدا ہوا نیز مواد کی چھان

پھٹک بھی پورے طور نہ ہو سکی حالانکہ غالب کی اپنی تحریروں سے جو مزید مواد مل سکتا تھا اس سے بھی کما حقہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔۔۔ اس زمانے میں جب کہ غالب کے حلقہء احباب میں اکثر لوگ زندہ تھے، ان کی تالیف کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا، ان کے خاندان کے افراد زندہ تھے، ان کے حالات کی چھان بین کے امکانات بڑے روشن تھے۔ حالی یقیناً اس سے بہتر تالیف بھی پیش کر سکتے تھے۔(۴۰)

حالی یادگار غالب کا آغاز تو سوانح عمری کی صورت میں کر رہے تھے لیکن سارا زور تنقیدی حصے پر صرف کر دیا۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

تکمیل کتاب کے بعد کیوں کہ انہیں دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ اور ابھرا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے پہلے حصے کو دوسرے کا ضمیمہ قرار دے دیا۔ اس کا سراغ اس سے بھی ملتا ہے کہ حالی شروع کے حصے میں اختصار کی طرف مائل تھے اور کتاب کو مختصر پیمانے پر لکھنا چاہتے تھے۔(۴۱)

حالی کی ''یادگار غالب'' پر ڈاکٹر وحید قریشی نے کڑی گرفت کی ہے اور اسے ''آب حیات'' کا چربہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے حالی پر اعتراض کیا ہے کہ لطائف و ظرافت بھی ''آب حیات'' سے مستعار ہے لیکن ''آب حیات'' میں صرف پندرہ لطائف درج ہیں اور وہ بھی ایک ہی جگہ۔ جب کہ ''یادگار غالب میں صرف سوانحی حصے میں ۳۴ لطائف اور وہ بھی موقع محل کے مطابق درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تصنیف ''نذر غالب'' میں ۱۸ اقتباسات کا تقابل دیا ہے جس سے مقصود یہ تھا کہ ''یادگار غالب'' ''آب حیات'' سے ماخوذ ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

آب حیات'' کا ایک خاص حصہ دواوین کے بغیر ''یادگار غالب'' کے اوراق میں دکھائی دیتا ہے۔ معمولی لفظی تغیر و تبدل نے آزاد کی دلکش عبارت کو حالی کی ایلی کھچڑی میں تو بدل دیا ہے۔ لیکن اکثر جگہ روزمرہ، محاورہ اور زبان و

بیان کے کینڈوں کی مماثلت پرانے مال کی غمازی کرتی ہے۔ (۴۲)

اس ضمن میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حالی کے مدنظر "آب حیات" بھی تھی لیکن اسلوب اور زیادہ تر واقعات ان کے اخذ کردہ ہیں۔ حالی نے تقریباً سترہ سال کے بعد "یادگار غالب" لکھی تو یقیناً وہ آب حیات دیکھ چکے تھے۔

اس بارے میں خلیل الرحمٰن داؤدی لکھتے ہیں:

> یادگار غالب" مرزا غالب کے حالات پر اولین کتاب ہے جو ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ دراصل یہ آب حیات مصنفہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کا ردعمل تھا۔ آزاد نے آب حیات لکھی تو اس میں اپنے استاد ذوق کا حال انتہائی شرح و بسط سے قلم بند کیا اور انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ذوق کے مقابلے میں غالب کا حال اچھا خاصا پھیکا تھا۔۔۔ آب حیات میں ذوق کا بیان ۶۵ صفحات پر اور غالب کا ذکر ۳۶ صفحات پر ہے۔ آب حیات ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی تو مولانا حالی کو یہ دیکھ کر قلق ہوا۔ (۴۳)

اس ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ حالی نے عبارت اور واقعات کو "آب حیات" سے چرایا ہوتا تو "دہلی کالج کی ملازمت" میں آزاد کی "آب حیات" کا غلط حوالہ نہ دیتے کہ یہ واقعہ ۱۸۴۲ء کا ہے۔ مذکورہ اعتراضات کا جواب ابوالخیر کشفی اپنے انداز میں دیتے ہیں:

> یہ اعتراضات بظاہر وقیع معلوم ہوتے ہیں اور کسی حد تک درست بھی ہیں لیکن ان کا بہترین جواب یادگار کا دیباچہ ہے۔ انتقادی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مصنف کے مقصد تصنیف کو اپنے سامنے رکھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہوا کہ نہیں۔ حالی نے یادگار کو حیات و کلام غالب کا تعارف یا انٹروڈکشن قرار دیا ہے اور اس اعتبار سے یادگار بڑی کامیاب بلکہ بے عیب کتاب ہے۔ اس حد تک بے عیب جس

حد تک انسان کی کوئی تخلیق ہو سکتی ہے۔ (۴۴)

محترمہ الطاف فاطمہ اپنی کتاب ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء'' میں ''یادگار لب'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

> اس میں نفسیاتی تجزیے کا فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ نقادان فن نے اس کو مرزا غالب کا جامع تذکرہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ سوانح نگار کا فرض ہے کہ اپنے ہیرو کی زندگی کے مسائل اور عقدہ ہائے لاینحل کو اس کی شخصیت اور ذات کو نفسیاتی مطالعہ اور تجزیہ کے ذریعے واضح کر کے ہر پیچیدگی اور الجھن کو دور کر دے اور مولانا حالی نے اس فرض سے پہلو تہی کی ہے۔۔۔ اس کی عبارت میں ایک قسم کی بے گانگی سی جھلکتی ہے اور عبارت کے انداز سے کسی طرح یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف ایسے کسی شخص کا ذکر کر رہا ہے جس سے اس کو بے انتہا انس اور محبت ہے۔ (۴۵)

اس ضمن میں پہلی بات یہ کہ حالی کو اردو کے پہلے باقاعدہ سوانح نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے سوانح نگاری کی بنیاد تو رکھ دی مگر اس پر کھڑی ہونے والی عمارت کی مشاطگی مستقبل کے سوانح نگاروں نے کی، دوم یہ کہ اس دور میں نفسیاتی مطالعہ یا تجزیہ کا اتنا استعمال اور رواج نہ تھا جتنا کہ موجودہ دور میں ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> حالی نے غالب کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ اپنے دور کے مذاق کے اعتبار سے وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ (۴۶)

سوم یہ کہ حالی کو صاحب سوانح سے انسیت اور محبت تھی جیسا کہ عام خیال کیا جاتا ہے کہ آزاد نے ''آب حیات'' میں اپنے استاد ذوق کو غالب سے برتر ثابت کرنے کی کوشش۔ آزاد کی استاد پرستی کو دیکھ کر ہی حالی کے دل میں اس جذبے نے جوش مارنا شروع کیا جو یادگار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بقول شمس الرحمن فاروقی:

> اس بارے میں حالی نے آخر، کتاب میں صاف لکھ دیا تھا کہ یہ اقتضاء طبیعت اور جوش کی بنا پر لکھی گئی ہے لہذا لازمی تھا کہ ''یادگار'' میں غالب

کے کردار و کوائف کے وہ پہلو کم سے کم نمایاں کئے جائیں جن سے غالب
کی شخصیت پر کسی قسم کی ضرب پڑتی ہو۔(۴۷)

اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

حالی ایک عقیدت مند شاگرد تھے وہ اپنے استاد پر تنقید ہی نہیں لکھ رہے تھے
اس کو اس کا جائز مقام بھی دلانا چاہتے تھے ،اس لیے وہ جج نہ تھے وکیل
تھے۔(۴۸)

یہاں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کی حالی کی تربیت علی گڑھ تحریک کی آغوش میں ہوئی تھی۔اس تحریک کے اثرات ان کی طبیعت میں اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ انہیں شاعری میں بھی جدیدیت کا ڈول ڈالنا پڑا۔دوسرے اس دور کے مطابق کسی شخصیت سے اتنی زیادہ وابستگی کا اظہار محال تھا۔ویسے بھی سوانح نگاری میں غیر جانب دارانہ رویہ ایک وصف تصور کیا جاتا ہے۔

بقول سید ابوالخیر کشفی:

حالی نے جس دور میں ''یادگار'' تحریر کی وہ سرسید کی تحریک سے پوری طرح
وابستہ ہو چکے تھے اور ادب کو فوری تعمیر کا وسیلہ سمجھتے تھے۔اس لئے بعض
نازک واقعات کی تفصیل سے انہوں نے دانستہ دامن کشی کی ہے۔مثلاً
غالب کی گرفتاری اور ان کی شراب نوشی۔یہ واقعات اس کتاب میں موجود
ہیں لیکن غزل کی زبان میں اور حالی سچے غزل گو تھے شاید ان کا دور ان
واقعات کی تفصیل پڑھ کر غالب کی ذات سے انصاف بھی نہ کر سکتا
تھا۔(۴۹)

ان تمام اعتراضات کے باوجود غالب کے معروف سوانح نگاروں نے ''یادگار غالب'' سے پہلو تہی نہیں کی اور اس کو بنیادی ماخذ کا درجہ دیا ہے حالانکہ تحقیق سے بعض واقعات کو غلط ثابت کیا ہے۔پھر بھی یادگار کی اہمیت مسلمہ ہے۔بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ''یادگار'' مستند نہیں۔مہر صاحب نے

اپنی کتاب میں کم وبیش بیالیس موقعوں پر "یادگارِ غالب" کے حوالے دیے ہیں مگر اختلاف چار پانچ امور ہی میں کیا ہے۔ باقی ہر چیز میں ان کے بیانات کو مستند ٹھہرایا ہے۔ (۵۰)

اس میں شک نہیں کہ حالی نے غالب کی سیرت کے خط وخال اس خوبی اور جامعیت کے ساتھ کھینچے ہیں کہ ہماری چشمِ تخیل انہیں جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور ہنسی و دل لگی کرتا ہوا دیکھ سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، غالب، لاہور: مسلم پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۶ء ص ۱۱
۲۔ شیخ اسماعیل پانی پتی، غالب اور حالی کے تعلقات" صحیفہ، حالی نمبر جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۲۷
۳۔ عبدالقوی دریابادی "یادگار غالب" (مضمون) مشمولہ احوال ونقد حالی۔ مرتبہ محمد حیات خان سیال لاہور: نذر سنز۔۱۹۸۰ء ص ۳۱۳
۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ اردو ادب، لاہور: علمی کتب خانہ اردو بازار، ۱۹۶۷ء ص ۳۱۶
۵۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، جدید اردو نثر، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔ ۱۹۶۳ء ص ۶۱
۶۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، غالب (مترجم) سید معین الدین قریشی، نئی دہلی: غالب انسٹیٹیوٹ، ۲۰۰۲ء ص ۱۳
۷۔ عبدالماجد دریا آبادی، "یادگار غالب" مشمولہ احوال ونقد حالی بحولہ بالا ۳، ص ۳۱۴
۸۔ ایضاً ص ۳۱۳
۹۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ مضمون "یادگار حالی" دہلی: کتابی دنیا لمیٹڈ، ۱۹۴۷ء ص ۳۶
۱۰۔ سید مسعود حسن رضوی، متفرقات غالب، رامپور: ہندوستان پریس، ۱۹۴۷ء مقدمہ ص ۱۹
۱۱۔ ایضاً ص ۲۰
۱۲۔ ایضاً ص ۲۲
۱۳۔ ایضاً ص ۲۵
۱۴۔ خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب) یادگار غالب، لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ طبع اول ۱۹۶۳ء، حاشیہ ص ۱۱۳
۱۵۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۵ء ص ۳۵
۱۶۔ خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب) یادگار غالب بحولہ بالا ۱۴۔ حاشیہ ص۔ ۳۶۔۳۷
۱۷۔ ایضاً حاشیہ ص۔ ۴۱

۱۸۔ ایضاً حاشیہ ص۔۴۹

۱۹۔ ظ۔انصاری، غالب شناسی، بمبئی: انٹرنیشنل ادب (ساہتیہ) ٹرسٹ ۱۹۶۵ء ص ۱۰۳

۲۰۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب اور شاہان تیموریہ، دہلی: اردو اکیڈمی ۱۹۷۲ء ص ۶۵

۲۱۔ انیس ناگی، غالب پریشاں، لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء ص ۱۳۶

۲۲۔ قاضی عبدالودود، جہان غالب، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۹۵ء۔ ص ۶۵

۲۳۔ ایضاً ص ۱۳۳

۲۴۔ ایضاً ص ۳۷

۲۵۔ عبدالعزیز ساحر، "غالب گمان سے یقین تک" بازیافت، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء ص ۳۳۷۔۳۸

۲۶۔ کالی داس گپتا رضا، غالب کی بعض تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء، مضمون "مثنوی بیان نمودار یشان نبوت ولایت" ص ۱۸، ۱۹

۲۷۔ قاضی عبدالودود: جہان غالب: محولہ بالا ۲۲۔ ص ۲۵۰

28. Ghalib; life amd letters; ralph Russell and Khurshidul Islam George Allen and unwin LTD, England, 1969.[F.N-p-357]

۲۹۔ غلام رسول مہر (غالب) محولہ بالا ۱۔ ص۔ ۹۸

۳۰۔ ایضاً ص ۱۰۹

۳۱۔ ایضاً ص ۲۷۷

۳۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اطراف غالب، لاہور: مکتوب پبلشرز۔ طبع اول ۱۹۶۸ء ص ۲۵۹

۳۳۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، غالب محولہ بالا ۶۔ ص ۳۱

۳۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: مضمون "یادگار غالب"۔ اورینٹل کالج میگزین۔ شمارہ نومبر ۱۹۳۶ء، ص ۷۵

۳۵۔ ڈاکٹر گیان چند: رموز غالب: ادارہ یادگار غالب، کراچی۔ ۱۹۹۹ء ص ۳۷۰

۳۶۔ ایضاً ص ۳۷۰

۳۷۔ غلام رسول مہر: غالب: بحولہ بالا ا۔ دیباچہ ص۔۴
۳۸۔ کالی داس گپتا رضا۔ غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے (یاداشتیں)، اعجاز سیمابی، مرتب، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء ص ۷۳
۳۹۔ شیخ محمد اکرم۔ حکیم فرزانہ۔ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۵۷ء، ص ۱۳،۱۲
۴۰۔ ڈاکٹر وحید قریشی، نذر غالب، لاہور: سنگ میل پبلیکشنز، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۷
۴۱۔ ایضاً ص ۸۹
۴۲۔ ایضاً ص ۲۰۶
۴۳۔ خلیل الرحمٰن داؤدی، یادگار غالب، بحولہ بالا ۱۳، ص ۳۶،۳۵
۴۴۔ سید ابوالخیر کشفی (مرتبہ)، یادگار غالب، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۲ء، ص۔۶
۴۵۔ الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء، ص ۳۶، ۳۷
۴۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ اطراف غالب، بحولہ بالا ۳۲، ص ۲۵۸،
۴۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، غالب کے چند پہلو، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۴۳
۴۸۔ ڈاکٹر گیان چند، رموز غالب، بحولہ بالا ۳۵، ص ۲۷۱،
۴۹۔ سید ابوالخیر کشفی (مرتبہ)، یادگار غالب، بحولہ بالا ۴۴، ص۔۷
۵۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اطراف غالب، بحولہ بالا ۳۲، ص ۲۵۹،

مصادر و مراجع

آزاد، محمد حسین، آب حیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ مضمون "یادگار حالی" دہلی: کتابی دنیا لمیٹڈ، ۱۹۴۷ء

اختر انصاری۔ غزل اور غزل کی تعلیم، تیسری اشاعت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء

اسداللہ خاں غالب، دستنبو، محمود سعیدی (مترجم) کراچی: الکتاب، اگست ۱۹۶۹ء

اسداللہ خاں غالب، دستنبو، محمود سعیدی (مترجم) الکتاب کراچی، اگست ۱۹۶۹ء

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۳ء

الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء

کالی داس گپتا رضا۔ غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے (یادداشتیں)، اعجاز سیمابی، مرتب، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء

اکبر حیدری، ڈاکٹر، نوادر غالب، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۲ء

اکبر حیدری، ڈاکٹر، غالبیات کے چند فراموش گوشے، کراچی: ادارہ یادگار غالب ۲۰۰۲ء

اکرام، شیخ محمد، ایم۔اے، حکیم فرزانہ (مرزا غالب کی نظم و نثر، شخصیت اور فلسفہ پر تفصیلی تبصرہ) فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۷ء

اکرام، شیخ محمد، غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء

انور سدید، غالب کا جہاں اور، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء

انیس ناگی، غالب پریشاں، لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۳ء

ایم۔سلطانہ بخش، ڈاکٹر (مرتب) اردو میں اصول تحقیق (جلد دوم) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

امیر حسن نورانی، غالب کی زندگی، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی ۶، مئی ۱۹۶۹ء

پرتو روہیلہ (مترجم) نامہ ہائے فارسی غالب، ترتیب متن فارسی، سید اکبر علی ترمذی، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۱۹۹۹ء

پرتو روہیلہ (مرتب ومترجم) باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ، اسلام آباد: بزم علم و فن پاکستان ۲۰۰۶ء

تحسین فراقی، ڈاکٹر، غالب۔ فکر و فرہنگ، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء

تحسین فراقی ڈاکٹر، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن (مرتبین) میر تقی میر: منتخب مضامین، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۰ء

جاوید رحمانی، غالب تنقید، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

جیلانی کامران، غالب کی تہذیبی شخصیت، راولپنڈی: خالد اکیڈمی، ۱۹۷۲ء

حالی، مولانا الطاف حسین، یادگار غالب، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء

حمید احمد خان، پروفیسر، مرقع غالب، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۲۰۰۳ء

خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب) یادگار غالب، لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ، طبع اول ۱۹۶۳ء

خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد اول) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء

خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد دوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء

خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد سوم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۷ء

خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد چہارم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء

خلیق انجم، غالب کے خطوط، غالب اور شاہان تیموریہ، دہلی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۲ء

خلیق انجم (مرتب) غالب۔ کچھ مضامین، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۹۱ء

خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۵ء

خواجہ احمد فاروقی، یاد و بود غالب، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۲ء

رام بابو سکسینہ، تاریخ اردو ادب، لاہور: علمی کتب خانہ اردو بازار، ۱۹۶۷ء

سلام سندیلوی، ڈاکٹر، جدید اردو نثر، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۳ء

سید ابوالخیر کشفی (مرتبہ)، یادگار غالب، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۳ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر، اطراف غالب، لاہور: گلوب پبلشرز۔ طبع اول ۱۹۶۸ء

سید مسعود حسن رضوی: متفرقات غالب، رامپور: ہندوستان پریس، ۱۹۴۷ء

سید معین الرحمٰن (مرتب) لطائف غیبی، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
سہیل احمد خاں، مجموعہ سہیل احمد خاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز (جلد اول، تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، اشاعت سوم، تصحیح شدہ ایڈیشن، ۲۰۰۵ء
شمس الرحمٰن فاروقی، غالب کے چند پہلو، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء
شمیم حنفی، غالب کی تخلیقی حسیت، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۸ء
طاہر تونسوی، ڈاکٹر، شاعر خوش نوا۔ فیض احمد فیض (ترتیب، تہذیب اور انتخاب) نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۱ء
طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ترتیب، فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)، القمر انٹرپرائزر، لاہور، ۲۰۱۱ء
ظ۔ انصاری، غالب شناسی، بمبئی: انٹرنیشنل ادب (ساہتیہ) ٹرسٹ ۱۹۶۵ء
عرشی، امتیاز علی، دیوان غالب (نسخۂ عرشی) علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۸ء
عبداللطیف، ڈاکٹر سید، غالب، سید معین الدین قریشی (مترجم) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ ۲۰۰۲ء
عبدالصمد صارم الازہری، مقامِ غالب، لاہور: نقوش پریس، اپریل ۱۹۶۸ء
عقیل احمد، ڈاکٹر (مرتب) جہات غالب، لاہور: شاہد پبلی کیشنز، س۔ن
غلام رسول مہر، غالب، لاہور: شیخ مبارک علی بک سیلر ۱۹۶۴ء
فاروقی، پروفیسر خواجہ احمد، یاد و بود غالب، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو ۱۹۹۳ء
قادری، محمد ایوب، ڈاکٹر، غالب اور عصر غالب، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۵ء
قدرت نقوی، سید، غالب کون ہے؟ ملتان: امروز پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء
قاضی عبدالودود، جہانِ غالب، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء
قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں (حصہ ۲) پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء
قطب الدین باطن، گلشن بے خزاں، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ
کالی داس گپتا رضا، غالب دوران خانہ، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمٹیڈ، دسمبر، ۱۹۸۹ء

کالی داس گپتا رضا، غالب کی بعض تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء
مالک رام، ذکر غالب، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، ۱۹۷۵ء
مجتبیٰ حسین، نقش فریادی کی غزلیں، مشمولہ،
محمد حیات خان سیال (مرتب) احوال ونقد حالی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء
کالی داس گپتا رضا، غالب کی بعض تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء
کلیات فیض، مکتبہ کارواں، لاہور، س۔ن
گیان چند، ڈاکٹر: رموز غالب: ادارہ یادگار غالب، کراچی۔۱۹۹۹ء
مختار الدین احمد، ڈاکٹر (مرتب) احوال غالب، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جون ۱۹۵۳ء
محمد عمر مہاجر، پنج آہنگ (آہنگ پنجم) غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء
محمد موسیٰ کلیم، مقام غالب، لاہور: جدید ناشرین، لاہور بازار، ۱۹۶۵ء
ممتاز حسین، غالب ایک مطالعہ، انجمن ترقی اُردو کراچی۔۲۰۰۳ء
مرزا اسد اللہ خاں غالب، پنج آہنگ، محمد عمر مہاجر (مترجم) کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۹ء
میرزا اسد اللہ خاں غالب، پنج آہنگ، تدوین وتصحیح وتحقیق، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مجلس یادگار غالب پنجاب، ۱۹۶۹ء
نتالیا پری گارنیا، ڈاکٹر، مرزا غالب (روسی سے ترجمہ) محمد اسامہ فاروقی، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۹۸ء
نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب، درفش کاویانی، باہتمام پروفیسر محمد باقر، لاہور: مجلس یادگار غالب، پنجاب، ۱۹۶۹ء
نظیر صدیقی، میرے خیال میں، بزم اردو مشرقی پاکستان، ڈھاکا، ۱۹۶۸ء
نواب صدیق حسن، شمع انجمن، بھوپال: مطبع شاہجہانی، ۱۲۹۳ھ
وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب) ارمغان ایران، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء
ڈاکٹر وحید قریشی، نذر غالب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، غالب کا ذوق تماشہ، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۱۹۹۷ء
ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخ جدید اُردو غزل، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع دوم، ۲۰۰۰ء
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، غالب اور آہنگ غالب، نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۱۹۷۱ء
یوسفی، مشتاق احمد، چراغ تلے، کراچی: مکتبہ دانیال، اشاعت چودھویں بار

یوسفی، مشتاق احمد، خاکم بدھن، کراچی: مکتبہ دانیال، اشاعت چودھویں بار ۲۰۰۰ء
یوسفی، مشتاق احمد، زرگزشت، لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن
یوسفی، مشتاق احمد، آب گم، لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن

رسائل وجرائد

افکار، غالب نمبر، فروری مارچ، ۱۹۶۹ء
اورینٹل کالج میگزین۔ شمارہ نومبر ۱۹۳۶ء
بازیافت، اورنٹیل کالج لاہور، جولائی تا دسمبر، ۲۰۰۳ء
بازیافت، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء
صحیفہ، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء
صحیفہ، حالی نمبر جنوری ۱۹۷۲ء
شاعر، بمبئی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء
قومی زبان، کراچی،
نقوش، طنز و مزاح نمبر، جنوری، فروری، ۱۹۵۸ء
نقوش، پطرس نمبر، مئی، ۱۹۵۹ء
نقوش، لاہور، مارچ، ۱۹۶۳ء، غالب نمبر ۱۹۶۹ء
نقوش" غالب نمبر ۱۱۱ فروری ۱۹۶۹ء
سہ ماہی ادبیات، فیض احمد فیض نمبر، جلد ۱۹، شمارہ ۸۲، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۹ء
قومی زبان، کراچی، فروری، ۱۹۹۶ء
ماہنامہ کتاب، لاہور، اقبال نمبر، شمارہ نومبر، ۱۹۷۳ء
سہ ماہی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء
ماہ نو، لاہور، مارچ، ۱۹۹۸ء

ENGLISH BOOK

Ghalib; life am d letters; ralph Russell and Khurshidul Islam George Allen and unwin LTD,

غالب کے شعر میں انسان کے نازک سے نازک، لطیف سے لطیف اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذبے اور احساس کو اظہار کی زبان عطا کرنے، اسے تصویر اور مجسمے کی صورت دینے اور تصویر اور مجسمے میں روح پھونک دینے کی جو غیر معمولی قوت ہے اس نے ہمارے لیے ہر تجربے کا ادراک ممکن بنا دیا ہے اور اس لیے غالب کا قاری جب اپنے کسی جذبے اور احساس کے معنی سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے یا اس کی تہ تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے ایک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے تو غالب کا کوئی نہ کوئی شعر سامنے آ کر اس سے کہتا ہے کہ دیکھو میں تمہاری الجھن اور تمہاری کشمکش کی تفسیر ہوں۔ اس صورت حال میں انسان کو حوصلہ دینے اور اس کا حوصلہ برقرار رکھنے کے جو امکانات ہیں انہوں نے غالب کے شعر کو ہر دل کی آواز بنا دیا ہے۔ آدمی کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اس کے دکھ کے معنی سمجھتا ہے اور اسے اظہار کی زبان دے سکتا ہے تو اس کے لیے زندگی بسر کرنا اور زندگی کو بسر کرنے کی چیز سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ غالب کے کلام نے اُردو کے ہر شاعر سے زیادہ یہ خدمت انجام دی ہے۔ صرف دکھوں ہی کی بات نہیں ہر انسانی تجربے کے معاملے میں غالب کے شعر اور اس شعر کو پڑھنے والے کے ساتھ یہی صورت ہے، زندگی کے ہر معاملے میں وہ بن بلائے اس کا رفیق و دمساز بن جاتا ہے۔

(پروفیسر سید وقار عظیم، اوراق، غالب نمبر اپریل ۱۹۹۶ء)

عکس
AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph: 042-37300584 Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail publications.aks@gmail.com
9789697812950